لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ

اشاعت نمبر ۱۴۱
سلسلۂ تراجم نمبر ۹

اُردو ترجمہ

تفسیر آیتِ کریمہ

تالیف

شیخ الاسلام حضرت امام ابن تیمیہ الحرانی متوفّی ۷۲۸ھ

مترجمہ

مولٰنا عبدالرحیم صاحب مرحوم ناظم مکتبۂ علوم مشرقیہ دارالعلوم پشاور

پبلشرز

الھلال بُک ایجنسی

فارُوق گنج بیرونِ شیرانوالہ دروازہ، لاہور

۱۹۵۵ء ۱۳۷۴ھ

مالکان

آفندی برادرس تاجرانِ کُتب وناشرین سلسلۂ تراجم واشاعت

طبع ثانی — تعداد ایکہزار — قیمت ۳/-

یک ہزار ——— طبع اوّل ۱۹۲۸ء بمطابق ۱۳۴۷ھ
یک ہزار ——— طبع ثانی ۱۹۵۵ء بمطابق ۱۳۷۰ھ

عبدالعزیز آفندی طابع و ناشر
نے
دین محمدی پریس لاہور میں چھاپ کر
دفتر الہلال بک ایجنسی فاروق گنج لاہور سے شائع کی

الحمد للہ وکفی والسلام علی من اتبع الھدیٰ، اما بعد:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی کسی تالیف کے ترجمہ پر مقدمہ لکھنا محض ایک رسم کو پورا کرنا ہے۔ اس لئے کہ خدا کے فضل سے اب اُردو خواں دُنیا حضرت امام ابن تیمیہؒ کے نام نامی سے ناآشنا نہیں رہی، نہ اُن کی جلالتِ منصب سے بے خبر ہے اور نہ مذاقِ تصنیف و تالیف سے بے بہرہ ہے۔ ہر خاص و عام اُن کی شہرت سے واقف ہو چکا ہے۔

کتاب و سنت کے انوار جس طرح اس داعیِ حق کی عام تصانیف میں نظر آتے ہیں اُن کی مثال شاید ہی کسی دوسری جگہ میسر ہو۔ پھر جو تالیف براہِ راست قرآن یا کسی آیت یا سورہ کی تفسیر اور اس کے متعلقہ مسائل کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہو، اُس کے محاسن کی نسبت کچھ کہنا محض تحصیلِ حاصل ہے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں بر سبیلِ تذکرہ متعدد علماءِ سلف و افاضلِ متقدمین کا قول ان کی زبانی نقل کیا ہے کہ: جب اللہ نے اُن پر احسان کیا اور امام ابن تیمیہؒ کے مؤلفات کے مطالعہ کی توفیق بخشی تو اُن کی ہر بات عقلِ سلیم کے مطابق پائی۔ اور وہ تمام پردے شک و ریب کے ہٹ گئے جو متکلمین کی قیل و قال نے اُن کی بصیرت پر ڈال دیئے تھے۔

اس کے بعد فرمایا: اگر کسی شخص کو اس بات کی صحت میں شک ہو تو امام موصوف کی مؤلفات آج بھی موجود ہیں، حسد و تعصب سے خالی ہو کر اُن کا مطالعہ کرے"۔ ہم کہتے

ہیں کہ واللہ! وہ حق و یقین اور طمانیتِ قلب کو پالیگا اور دلائل واضحہ و براہینِ قاطعہ کا عروۃالوثقیٰ اُس کے ہاتھوں میں ہوگا۔

یہ کتاب، درحقیقت آیتِ کریمہ کے متعلق ایک استفتاء کا جواب ہے جو فتاویٰ ابن تیمیہؒ کی دوسری جلد میں چھپا ہے۔ اس میں حضرت امام ابن تیمیہؒ نے آیتِ کریمہ کے تمام ضروری مباحث اور دوسری مفید و اہم باتیں بیان کی ہیں۔ جو شاید دوسری جگہ کہیں بھی دستیاب نہیں ہوسکتی۔ افسوس کہ حضرت امامؒ کی مکمل تفسیر ضائع ہوگئی یا شاید کہیں موجود ہو (جیسا کہ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ لندن یونیورسٹی میں ہے) مگر عام دُنیا اس سے بے خبر ہے اور اسے سورۂ نور، سورہ کوثر، سورہ اخلاص اور المعوّذتین کے سوا کچھ معلوم نہیں۔ اس لئے حضرت امام کی تفسیر کے متعلق جو کچھ بھی مل رہا ہے، مغتنمات میں سے ہے آیتِ کریمہ کی اس تفسیر کی حیثیت بھی یہی ہے۔

آیتِ کریمہ کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۲۸ء میں چھپا تھا اور مدت ہوئی ختم ہوچکا تھا۔ لیکن چند در چند مجبوریوں کی بنا پر اس کی اشاعت معرضِ تعویق میں پڑی رہی۔ اب بھی اگرچہ ہجومِ مشکلات و مصائب رفع نہیں ہوئے، لیکن یہ ایک خاص فضلِ ربانی ہے کہ کامل ۱۹ برس کے بعد اندریں حالات ہمیں آیتِ کریمہ کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی توفیق دی ہے جس کے ہم بیحد شکرگزار ہیں۔ ورنہ حالات کا تقاضا اِس کی اشاعت کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ واللہ الحمد۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میدان میں زیادہ سے زیادہ خدمت وسعی کرنے کی توفیق بخشے اور تمام مسلمانوں کو کما حقہٗ مستفید ہونے کی۔ فقط والسلام مع الاکرام۔

۱۵۔ جون ۱۹۴۷ء

عبدالعزیز آفندی

فہرستِ مضامین تفسیر آیت کریمہ

فصل ۶

توحید اور استغفار کی مناسبت

فصل ۷

توحید ربوبیت اور توحید الوہیت

باب ۳

اطاعت الٰہی و اطاعت رسول

فصل ۱

رسول اللہ اور غیر اللہ

فصل ۲

ایمان اور اسلام کا مفہوم

فصل ۳

تصدیق قلبی اور عمل قلب

تفسیر آیتِ کریمہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ

(اے پروردگار) تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تیری ذات پاک بے عیب ہے، بیشک میں ہی ظالموں میں سے ہوں

تمہید

استفتاء کسی شخص نے شیخ الاسلام حضرت امام ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ وارضاہ سے دریافت کیا کہ یہ جو احادیث میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

دعوۃ اخی ذی النون: لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ مَا دعا بھا مکروب الا فرج اللہ کربتہ

میرے بھائی حضرت یونس علیہ السلام کی دعاء "لآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" کے ذریعہ سے جو کوئی بھی مصیبت زدہ دعا کرے گا تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت دور کر دیگا۔

حضرت! آپ فرمائیں، اس بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ اس سلسلہ میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا جواب باصواب دے کر ممنون فرمائیں۔ عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہوں۔ سوالات درج ذیل ہیں:

۱ - ان الفاظ کو لفظ دعا سے تعبیر کرنے کے کیا معنی ہیں؟

۲ - ان الفاظ میں مصیبت دور کرنے کی کونسی حکمت ہے؟

۳ - جب آدمی یہ الفاظ منہ سے نکالے تو کیا ان کے ذریعے درجۂ پذیرائی حاصل کرنے کے لئے کسی باطنی شرط یا شروط کا ہونا لازمی ہے ؟

۴ - مصیبت دُور کرنے کی خاصیت ان الفاظ میں کیونکر رکھی گئی ہے ؟

۵ - اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ کے الفاظ کو توحید کے ساتھ کونسی مناسبت ہے، جس کی بنا پر ان دونوں کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا گیا ہے ؟

۶ - کیا توبہ کی مقبولیت کے لئے صرف اپنے گناہ یا قصور کا اعتراف کرلینا ہی کافی ہے، یا آئندہ ترک کردینے کا عزم مصمم وغیرہ کوئی اور شرط بھی ضروری ہے ؟

۷ - اس میں کیا راز ہے کہ مصیبت اسی صورت میں دُور ہوتی ہے کہ آدمی تمام مخلوقات سے اپنی اُمید و بیم کا رشتہ بالکل منقطع کرلے، اور ماسوی اللہ سے دُور کا تعلق بھی نہ رکھے ؟

۸ - مخلوقات سے علائق قطع کرنے اور کلیتہً خدائے واحد سے رشتہ جوڑنے کی کیا تدبیریں ہیں ؟

بَیِّنُوْا وَ تُوْجَرُوْا - | اِن ساری باتوں کا جواب شرع شریف کے مطابق بیان فرمائیں، اور اس کا اجر اللہ تعالیٰ سے پائیں -

جوابِ فتویٰ | شیخ الاسلام علیہ الرحمتہ نے اس کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، جو امام ممدوح کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ | ساری حمد و ستائش اللہ جل و علیٰ کی شان کے شایاں ہے، جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے -

.... الحمد للہ رب العالمین

باب (۱)

دعائے یونسؑ کی معنوی مناسبت

فصل ۱

دعا بمعنی عبادت و سوال

شواہدِ قرآن لفظ[1] "دعا" اور "دعوت" کا اطلاق قرآنِ کریم میں دو مختلف معانی پر ہُوا ہے: ایک عبادت، دوسرے سوال۔ جن آیتوں میں دعاء کا لفظ عبادت کے لئے استعمال ہُوا ہے، اُن میں سے بعض یہ ہیں۔ غیر اللہ کی عبادت کرنے کے متعلق فرمایا:

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ فَتَکُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِیْنَ۔ (۲۶ : ۲۱۳)

(اے نبیؐ!) آپؐ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت نہ کریں، ورنہ آپؐ بھی عذاب پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

وَمَنْ یَّدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ لَا بُرْھَانَ لَہٗ بِہٖ فَاِنَّمَا حِسَابُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْکٰفِرُوْنَ۔ (۲۳ : ۱۱۷)

جو شخص اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی پرستش کرتا ہے جس کی اس کے پاس کوئی سند نہیں، تو اس کی جوابدہی اس کے پروردگار کے ہاں ہوگی۔ (اللہ کا فیصلہ ہے کہ) کافر نجات نہیں پاتے۔

---

[1] یہاں سے پہلے سوال کا جواب شروع ہوتا ہے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ (۲۸ : ۸۸)

(اے نبی!) آپ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی عبادت نہ کریں۔ اس کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں۔ اس کی ذات کے سوا سب چیزیں ہلاک ہونے ہیں۔ وہی پادشاہ ہے جس کے حضور تم کو حاضر ہونا ہے۔

خدا کی عبادت کرنے کی ترغیب دلانے کے لئے فرمایا :

وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا [له] ۔ (۷۲ : ۱۹)

جب اللہ کا بندہ (نبیؐ) اس کی عبادت کرنے کو کھڑا ہوتا، تو وہ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے (انبوہ در انبوہ جمع ہوتے)۔

شیطان کی عبادت کرنے سے ڈرانے کی خاطر فرمایا :

وَاِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا (۴ : ۱۱۷)

(بیشتر لوگ) اللہ کے سوا بتوں کی پرستش کرتے ہیں (جن کو وہ عورتیں تصور کرتے ہیں) درحقیقت وہ شیطان مردود کی پوجا کرتے ہیں۔

سچی عبادت کی تلقین اس طرح فرمائی :-

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۗءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۭ وَمَا دُعَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۔ (۱۳ : ۱۴)

اللہ ہی کی عبادت سچی عبادت ہے۔ جو لوگ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں وہ ان کی دعا کا جواب نہیں دیتے، مگر مثل اس آدمی کے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے کہ اس کے منہ میں پہنچ جائے۔ حالانکہ وہ پانی اس کے منہ میں پہنچنے والا نہیں ہے۔ کافروں کی عبادت برباد اور رائگاں جاتی ہے۔

له كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا کے معنی ہیں وہ یکے بعد دیگرے صفیں باندھ کر کثرت اژدحام سے اس پر گرے پڑتے کہ قرآن سنیں۔ یا عجیب چیز سمجھ کر جمع ہونے اور بھیڑ کرنے۔ اس سے مراد جنوں کی جماعت ہے اور مومنوں کو ترغیب دلائی ہے۔ (مترجم)

اور غیر اللہ کی عبادت نہ کرنے والوں کے بارہ میں فرمایا:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ۔ (۲۵: ۶۸)	جو لوگ اللہ کے ہمراہ کسی دوسرے معبود کی عبادت نہیں کرتے اور جس جان کو مارنے سے منع کیا گیا ہے، اُسے نہیں مارتے مگر سچائی کے ساتھ، اور نہ وہ زنا کرتے ہیں۔

اسی سورہ کے آخر میں فرمایا:

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ۔ (۲۵: ۷۷)	(اے نبیؐ! کافروں سے) فرما دیجئے، میرے پروردگار کو تمہاری کیا پرواہ ہے اگر تم نے اس سے دعا و عبادت نہ کی۔

دُعاء اور صلوٰۃ کا تسمیہ یہاں لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ایک بہت قوی جملہ ہے کیونکہ اس میں مصدر اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے۔ اگر مفعول کی طرف اضافت ہوتی تو بات اتنی زوردار نہ ہوتی۔ لہٰذا اس کے معنی یہ ہوئے کہ: اسی کی عبادت کرو اور اسی سے سوال کرو۔ اسی کے ساتھ فرمایا ہے:

فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا۔ (۲۵: ۷۷)	تم نے چونکہ اس کی تکذیب کر دی ہے، لہٰذا عنقریب اس کا عذاب لازم ہو جائیگا۔

یعنی جھٹلانے والوں کے لئے عذاب لازمی ہے۔

لفظ صلاۃ بھی اصل میں لفظ دُعا ہے اور اس کا نام صلوٰۃ اس بناء پر رکھا گیا کہ اس کے مفہوم میں دُعا کے دونوں معنی شامل ہیں: عبادت کرنا اور سوال کرنا۔ لفظِ صلوٰۃ کی اس تفسیر کی فرمانِ الٰہی سے بھی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا:

قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ (۴۰: ۶۰)	تمہارا پروردگار فرماتا ہے، تم مجھ سے دُعا کرو میں تمہاری دُعا قبول کرتا ہوں۔

دو وجوں سے ایسا کہا گیا ہے۔ ایک یہ کہ تم میری عبادت کرو اور دوسرے یہ کہ میرے

حکم کی تعمیل کرو۔ تم ایسا کروگے تو میں تمہاری بات کو شرفِ قبولیت بخشوں گا۔ جیسا کہ دوسری جگہ بیان ہے:

وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ۔ (۴۲: ۲۶)	اللہ ان لوگوں کی دُعا قبول فرماتا ہے جو ایماندار اور نیک عمل کرنے والے ہیں۔

یعنی استجاب لھم، اللہ تعالیٰ انہیں مقبولیّت سے مشرّف فرمائیگا۔

توگویا یہ بات واضح ہے کہ لغتِ عرب میں دُعاء کا لفظ بمعنی عبادت بھی استعمال ہوتا ہے، اور بمعنی سوال وطلب بھی، جو محتاجِ ثبوت نہیں، کیونکہ دُعا ر کے معروف ومتبادر معنی یہی ہیں۔ جیساکہ استجابه واستجاب له کے متعلق شاعر کہتا ہے

ودا ع یا من یجیب الی النّدی

فلم یستجبه عند ذاك مجیب

(ترجمہ) پکارنے والے نے کہا: اے نداؤں کے سننے والے! وہ تجھ سے کیوں نہ مانگے جب تو قبول کرنے والا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تم مجھ سے مانگو، تو میں تم کو دے دونگا۔ فرمایا:

سَلُونِيْ اُعْطِكُمْ۔ (   ) مجھ سے مانگو، دئے جاؤگے۔

صحیحین میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ینزل ربنا کل لیلة الی السماء الدنیا حین یبقی ثلث اللیل الأخر، فیقول "من یدعونی فاستجیب له، من یسألنی فاعطیه، من یستغفرنی فاغفر له"۔	ہمارا پروردگار ہر ایک رات آسمانِ دُنیا پر نزول فرماتا ہے۔ جبکہ رات کا ایک تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے، پھر فرماتا ہے: کوئی ہے جو مجھ سے دُعا کرے، تو میں اس کی دعا قبول کرلوں۔ کوئی ہے جو مجھ سے سوال کرے تو میں اس کا سوال پورا کردوں۔ کوئی ہے جو مجھ سے مغفرت کا طلبگار ہو کہ میں اُسے بخش دوں؟

سائل اور داعی

اس میں بھی سب سے پہلے لفظ دُعاء کا ذکر ہے اور اس کے بعد سوال اور استغفار کا ذکر ہے۔ اور بخشش مانگنے والا بھی ایک سائل کی حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ ایک سوال کرنے والا بھی ایک داعی ہے۔ لیکن بُرائی دفع کرنے والے سائل کا ذکر، طالبِ خیر کے سوالی کے ذکر کے بعد کیا ہے۔ اور پھر ان دونوں کا اکٹھا ذکر لفظِ داعی کے بعد کر دیا ہے جو نہ صرف ان دونوں کے معنوں پر اطلاق رکھتا ہے۔ بلکہ ان کے علاوہ اور معنوں پر بھی حاوی ہے۔ پس یہ ایک خاص بات کو عام سے معطوف کرنے کی قسم سے ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ، اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ (۲ : ۱۸٦)	(اے نبیؐ) جب میرا بندہ آپ سے میری بابت سوال کرے تو (فرما دیجئے) میں نزدیک ہی ہوں، پکارنے والے کی دعا کو سُن لیتا ہوں جب بھی وہ بلاتا ہے۔

ہر دو معانی کا ارتباط و احتمال

عبادت اور سوال کو دُعاء کے دونوں معانی میں ایک گونہ ارتباط ہے۔ کیونکہ ہر ایک شخص جو کسی چیز کا سوال کرتا اور اس کا طلبگار ہوتا ہے، اس میں رغبت اور خوف کی صفت[1] پائی جاتی ہے۔ نیز جس سے سوال کرتا ہے، اس کے آگے اپنے آپ کو ذلیل کرتا اور اس کے سامنے جُھکتا ہے۔ اور عبادت کا بھی قریب قریب یہی مفہوم ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی کی عبادت کرتا ہے، وہ اس سے حصولِ مطالب کا اُمیدوار ہو کر اس کی بارگاہ میں راغب ہوتا ہے، اور اس کے جی میں ناکامی کا بھی خطرہ لگا رہتا ہے۔

عابد اور سائل

الغرض ہر ایک عابد سائل ہے اور ہر ایک سائل عابد۔ اور عبادت اور سوال دونوں لازم ملزوم ہیں اور اسی لئے ہر ایک لفظ ان میں سے الگ الگ استعمال ہو تو وہ دونوں معانی کے لئے استعمال ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔

---

[1] کیونکہ وہ کامیابی کے حصول میں راغب اور اس کے عدم حصول سے خائف و ہراساں رہتا ہے۔

لیکن جب دونوں لفظ ایک ہی موقع پر استعمال ہوں تو سائل کے لفظ کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے الفاظ کے ذریعے کسی نفع کے حصول یا کسی ضرر کے دفعیہ کا خواہاں ہے۔ لیکن ایک عابد کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ حکم کی اطاعت کرکے اپنے مُدّعا کا خواہاں ہوتا ہے، لیکن اُس کے الفاظ میں صریح سوال اور الفاظ کی شکل میں درخواست نہیں ہوتی

فصل ۲

نصب العین عبادت

رغبت اور خوف

جو لوگ خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کیلئے عبادت کرتے ہیں، وہ بھی رغبت و رہبت اور رخوف ورجا سے خالی نہیں۔ اپنی مُراد کے پورا ہو جانے کی رغبت رکھتے ہیں اور اس کے فوت ہو جانے سے ہراساں رہتے ہیں۔ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اخلاص کے اعلیٰ ترین مقامات پر فائز تھے، بایں ہمہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں ان کی عبادت کے نصب العین کو رغبت اور خوف سے تعبیر فرماتا ہے:

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ (۲۱: ۹۰)	بیشک یہ پیغمبر نیکیوں کے بجالانے میں نہایت مستعدی سے کام لیتے تھے اور رغبت اور خوف کے محرک سے متاثر ہو کر وہ ہماری عبادت میں مشغول رہا کرتے تھے اور ہماری ہی بارگاہ میں وہ عاجزی کرتے تھے۔

ایک دوسری جگہ پر مقربین بارگاہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا	(رات کو عبادت کرتے ہوئے) ان کے پہلو اپنے نرم بستروں سے جدا ہو جاتے ہیں اور وہ بیم و اُمید کے جذبات سے اپنے

وَ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ - (۳۲ : ۱۶)	خدا کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق عطا فرمایا ہے اس سے (راہِ خدا میں) خرچ کرتے ہیں۔

بہرکیف کسی عابد یا سائل کا خوف اور رغبت کے جذبات سے خالی ہونا ناممکن ہے

خوف و رجا بعض مشائخ طریقت سے منقول ہے کہ "خوف و رجا عوام کے مقامات سے ہے"۔ اور اس قول کی یہ تشریح کی گئی ہے کہ مقرّبین کے مدّنظر صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے، اور وہ کسی مخلوق چیز سے لذت حاصل کرنے کے خواہشمند نہیں ہوتے۔ لیکن وہ بہرحال کسی مدّعا کے حصول کے خواہاں اور اُس سے محروم رہ جانے کے اندیشہ سے لرزاں رہتے ہیں۔ خواہ ان کا مطمحِ نظر کتنا بُلند اور مقصد کتنا اعلیٰ و ارفع ہے۔

دوزخ اور جنّت بعض مشائخ سے یہ بھی منقول ہے کہ "بارِ خدایا! میں نے جنّت کے حصول کی خاطر یا دوزخ سے ڈر کر تیری عبادت نہیں کی" اس قول کے قائل کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ جنّت، جسمانی حظوظ کا نام ہے اور دوزخ کا مفہوم ظاہری عذاب تک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالمِ آخرت میں جتنی جسمانی اور روحانی نعمتیں اپنے پیارے بندوں کے لئے تیار کر رکھی ہیں، وہ سب جنّت کے مفہوم میں داخل ہیں، اور دوزخ اس کی ضد ہے۔

اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن کا رتبہ سب سے بڑھ کر ہے، ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے جنّت کا سوال کرتے اور دوزخ کے عذاب سے پناہ مانگتے[1] جیسا کہ حدیث میں

---

[1] طریقۂ نقشبندیہ کے ایک مشہور مقتدا امام ربّانی علیہ الرحمۃ نے جو مجدّد الف ثانی کے لقب سے معروف ہیں، اپنے مکتوبات میں بعینہٖ یہی تقریر لکھی ہے۔ یہ حوالہ دینے سے میرے دو مقصد ہیں: ایک یہ کہ جو لوگ حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اور ان کے عقیدت مندوں کو اولیاء اللہ کا منکر خیال کرتے ہیں، وہ خود مشائخ طریقت کے کلام میں ان کا مضمون پڑھ لیں۔ دوسرے یہ کہ بعض غالی اہل حدیث سب مشائخ کو ایک جیسا خیال کرتے ہیں، اُن کی بھی یہ غلط فہمی دُور ہو۔ (مترجم)

وارد ہے کہ آپؐ کے اصحابؓ نے دریافت کیا کہ آپؐ اپنی نماز میں کیا پڑھا کرتے ہیں تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:

إِنِّي أَسْأَلُ الْجَنَّةَ وَأَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ النَّارِ۔	میں جنّت کا سوال کرتا ہوں اور دوزخ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

نیز آپؐ نے فرمایا کہ ایسی آواز سے بات کرنا کہ سمجھ میں نہ آسکے، ایسی گھنگناہٹ کو میں پسند نہیں کرتا۔ جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے[1]۔

دیدارِ خداوندی اور علمائے کلام

بعض علمائے کلام یہ کہنا قابلِ اعتراض خیال کرتے ہیں کہ:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ لَذَّةَ النَّظَرِ إِلَى وَجْهِكَ۔	بارخدایا! میں تجھ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ مجھ کو اپنے دیدار کی لذّت سے بہرہ ور فرما۔

"اُن کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیدار سے لذّت حاصل کرنا کچھ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ لذّت ہمیشہ کسی محسوس اور جسمانی چیز سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک اِن باتوں سے بالاتر ہے۔"

یہ خیال بھی بالکل باطل ہے اور ان لوگوں کو بھی پہلے فریق کی طرح جنّت کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے فریق کی طلب اور درخواست ٹھیک ہے، برخلاف اس کے مؤخر الذکر جماعت نے ایک جائز درخواست کا انکار کیا اور اس کو قابلِ اعتراض خیال کیا ہے۔

---

[1] انی لا احسن دندنتک الا دندنۃ معاذ فقال حولها ندندن۔

فصل ۳

اظہارِ عزیمت اور رُونمائی حقیقت

اکابرِ طریقت کا قول

دوزخ کے عذاب سے درد محسوس کرنا "حقیقت" اور امرِ واقع ہے (جس کی برداشت انسان کی طاقت سے بالاتر ہے۔ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ)۔

اور یہ جو بعض اکابر طریقت کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اگر مجھ کو اللہ تعالیٰ دوزخ میں بھی ڈال دے تو اس پر میں راضی ہونگا" یہ ایک عزیمت کا اظہار ہے۔ لیکن بعض اوقات حقیقت کے رونما ہونے پر عزیمت قائم نہیں رہتی۔

سمنونؒ اور اُن کا ابتلاء

ایک مشہور بزرگ ہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا:

ولیس لی فی سواک حظّ فکیف ما شئت فامتحنی	مجھ کو بغیر تیرے کسی چیز سے لطف حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے جس طرح بھی تو چاہے، مجھے آزما لے۔

اس کے بعد وہ عسر البول کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے (تب اُن کی آنکھیں کھُلیں) چنانچہ وہ مدرسوں اور مکتبوں میں جا کر معصوم بچوں سے دفع تکلیف کے لئے دعا کراتے پھرتے اور اُن سے کہتے کہ اپنے جھوٹے چچا کے لئے دُعا کرو۔

شہادتِ قرآنی

کلامِ پاک میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔ (۳: ۱۴۳)	بیشک تم موت سے مُلاقی ہونے سے پیشتر اُس کے خواہاں تھے لیکن اب تم نے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا (اب کیوں چلاتے ہو)

الغرض کسی چیز کا تصور باندھ کر کوئی ارادہ کر لینا اور بات ہے، اور حقیقت کا ظہور میں آنا کچھ اور بات ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ

بعض اصحابِ تصوّف نے مقامات کے پوشیدہ نقائص پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "محبت و رضا اور خوف و رجا عوام کے مقامات ہیں، واصلِ حقیقت جب دیکھتا ہے کہ جو کچھ بھی عالم میں ہو رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے، تو اُس کے دل سے یہ اوہام نکل جاتے ہیں۔"

لیکن یہ قول سراسر غلط اور حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص جو زندہ ہے، کسی مرغوب چیز کی محبت یا مبغوض چیز کی نفرت اپنے دل میں محسوس نہ کرے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ انسان زندہ اور صاحبِ حواس ہو کر کائنات کے نیک و بد کو ایک جیسا محسوس کر سکتا ہے۔ تو ایسا کہنے والا یا تو جاہلِ مطلق ہے کہ جو کچھ منہ سے کہتا ہے، اس کی حقیقت کا تصور نہیں کر سکتا۔ یا مکّار ہے اور حقائق کے وجود کا دانستہ انکار کرتا ہے۔

مقامِ فنا اور دعوائے محویّت

اگر فرض کر لیا جائے کہ بعض حالتوں میں انسان کی عقل زائل ہو جاتی ہے، جس کو محویت اور فنا، وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو ایسے شخص کا بھی احساس بالکلیہ زائل نہیں ہوتا۔ بلکہ موافق اور مخالف کے حُبّ و بُغض کا احساس فی الجملہ اس میں قائم رہتا ہے اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ توحیدِ افعال اور توحیدِ ربوبیّت کا مشاہدہ کرانے والے جمع اور فنا کے مقام پر فائز ہو کر کسی موافق اور مخالف چیز کی بابت حُبّ اور بُغض یا رغبت اور نفرت کا بالکل احساس نہیں کرتے۔ دو مختلف چیزوں میں فرق محسوس کرنا ناگزیر ہے، اور اگر آدمی اُس فرق کو محسوس نہ کرے جو شریعتِ غرّا نے بیان کیا ہے تو لامحالہ وہ طبعًا مختلف اشیاء اور مختلف اُمور میں فرق محسوس کریگا اور اس حالت میں وہ اپنے

مولیٰ کی مرضی کے تابع ہونے کی بجائے اپنی ہوائے نفس کا پیرو ہوگا۔

شیخ جنید بغدادیؒ

یہی وجہ ہے کہ جب یہ فنا اور محویت کا مسئلہ سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پیش کیا گیا، تو آپ نے تصریح فرمائی کہ توحیدِ افعال کا مشاہدہ کرتے ہوئے مامور اور محظور میں فرق کرنا، اور جن باتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جن کو ناپسند سمجھتا ہے، اُن میں امتیاز کرنا لازم ہے"۔ لیکن اگر کوئی اس شرعی فرق کو اُٹھا دے تو وہ یقیناً دائرۂ اسلام سے خارج ہوگا، اور بلحاظِ شر بھی وہ عام کافروں سے بدتر ہوگا۔ کیونکہ یہی لوگ ہوتے ہیں جو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور دوسرے اشخاص میں تمیز نہیں کرتے بلکہ دونوں کو برابر سمجھنے لگتے ہیں، اور رفتہ رفتہ وحدتِ وجود کے قائل ہو کر خالق اور مخلوق کا فرق بھی اُٹھا دیتے ہیں اور دونوں کو ایک سمجھتے ہیں۔

آمدم برسرِ مطلب

تاہم سب کا یہ انجام نہیں ہوتا، بلکہ اکثر ان میں سے فی الجملہ فرق کو قائم رکھتے ہیں، اور اس لئے کبھی تو اللہ تعالےٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں اور کبھی نہیں۔ ان اُمور کی تفصیل کے لئے یہ جگہ نہیں۔

یہاں پر بتانا یہ تھا کہ دُعا کا لفظ ہر دو معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۱۰ : ۱۰)	اور اہلِ جنت کی دعا کا خاتمہ یہ ہوگا کہ تمام تعریف اور ثنا اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے جو تمام عالموں کا پروردگار ہے۔

فصل ۴

مُصیبت دُور کرنے کی خاصیّت

ارشاداتِ نبویؐ ابن ماجہ کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: سب سے اچھا ذکر "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" ہے، اور سب سے بہتر دُعاء "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے (جس کو سائل نے اپنے استفتاء میں ذکر کیا ہے) کہ میرے بھائی یونس علیہ السّلام کی دُعا ہے، یعنی:

لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ (۲۱ : ۸۶)	(اے پروردگار) تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بیشک میں (اپنے حق میں) ظالم ہوں۔

اگر کوئی مصیبت زدہ اِن الفاظ میں دُعاء کرے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اُس کی مصیبت کو دُور کر دے گا۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس حدیث میں یونس علیہ السّلام کے مُنہ سے نکلے ہوئے کلمات کو دُعاء کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، کیونکہ وہ دعاء کے دونوں معانی پر مشتمل ہیں۔

اس کا پہلا حصّہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ" توحیدِ الوہیّت کا اعتراف ہے، اور یہ اعتراف دُعاء کے ہر دو معانی کو شامل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی کو یہ استحقاق حاصل ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اسی سے قضائے حاجات کی بابت سوال کیا جائے[1]۔

---

[1] شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کلام میں یعنی اپنی تصنیفات میں اور نیز اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں مختلف جگہوں پر توحیدِ الوہیت اور توحیدِ ربوبیّت کا فرق نہایت شدومد کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اُن کے کلام کا ملخص یہ ہے کہ "توحید کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ تمام دنیا کا خالق و رازق ایک ہے اور وہ قادرِ مطلق ہے۔ اس کا نام "توحیدِ ربوبیت" ہے اور (باقی حاشیہ صفحہ ۲۵ پر دیکھو)

حضرت یونس علیہ السلام کی دعاء کا دوسرا حصہ "اِنِّی کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" اپنے گناہ اور قصور کا اقرار ہے، جس کے ضمن میں طلب مغفرت کا سوال مضمر ہے۔ کیونکہ سائل کبھی تو اپنے سوال میں صریح طلب کا صیغہ استعمال کرتا ہے جیسے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ، اور کبھی صرف اخبار کو سوال کا ذریعہ بناتا ہے۔

سوال کی مختلف صورتیں

سوال کی پھر کئی صورتیں ہیں :-

اوّل یہ کہ اپنے حال کا اظہار کیا جائے۔

دوم یہ کہ جس سے سوال کیا جائے، اس کی کوئی مناسب حال صفت بیان کردی جائے۔

سوم بعض اوقات اِن دونوں کا بیان ہوتا ہے۔

پہلی صورت کی مثال حضرت یونس علیہ السلام کا مندرجہ بالا قول ہے۔ یا جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا :

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۔ (۷ : ۲۳)	پروردگارا! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اب اگر تُو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم یقیناً نقصان اُٹھانے والے زیاں کار ہو جائیں گے۔

اِن ہر دو اقوال میں اپنی حالت کا بیان ہے اور ضمناً طلب مغفرت چاہی ہے۔ اگرچہ بظاہر کوئی ایسا لفظ نہیں بولا، محض ایک خبر بیان کی ہے کہ عدم مغفرت اور کرم نوازی سے شاد کام نہ فرمانا موجب خُسران ہوگا۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۲۴) مشرکوں کو بھی اس سے انکار نہیں، جیسے کہ قرآن مجید میں کثرت سے ان کے اس عقیدہ کا ذکر ہے۔ دوسرے یہ کہ صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود سمجھے، اسی کے سامنے اپنا سر جھکائے، اسی سے قضائے حاجات کی بابت درخواست کرے، اسی کی ذاتِ پاک پر اس کا بھروسہ ہو اور اسی کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھے۔ اس کو توحیدِ الوہیت کہتے ہیں، اور اسی توحید کی تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے تعلیم دی ہے۔ قرآن کریم نے بھی جابجا اسی توحید کی طرف لوگوں کو بلایا ہے اور بغیر اس کے آدمی مسلمان نہیں ہوتا۔ (مترجم)

اسی قبیل سے حضرت نوح علیہ السلام کا اقبالِ جرم بھی ہے کہ انہوں نے کہا:

رَبِّ اِنِّیٓ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اَسْئَلَکَ مَا لَیْسَ لِیْ بِہٖ عِلْمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْٓ اَکُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ - (۱۱ : ۴۷)	پروردگارا! میں تیری پناہ میں آتا ہوں کہ میں نے تجھ سے ایک ایسی بات کا سوال کیا جس کا مجھے علم نہ تھا۔ اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور مجھ پر ترحم نہ فرمایا تو میں زیاں کاروں میں سے ہو جاؤں گا۔

اس میں بھی بیانِ خبر طلب مغفرت کو شامل ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ملاحظہ ہو:

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ - (۲۸ : ۲۴)	پروردگارا! میں اُس نعمت کا محتاج ہوں جو تُو میری طرف اُتار دے۔

یہ اُن کے حال کی ہو بہو تصویر ہے۔ نزولِ خیر و برکتِ خداوندی کا محتاج ہونا ہی ایک سوال ہے جو رحمتِ الٰہی کو کھینچ کر لاتا ہے۔ امام ترمذی نے روایت کی ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من شغلہ قراۃ القراٰن عن ذکری و مسألتی اعطینہ افضل ما اعطی السائلین -	جس شخص کو تلاوتِ قرآنِ مجید نے میری یاد اور سوال کرنے سے غافل کر دیا ہو، میں اسے تمام سائلوں سے بھی زیادہ عنایت کر دیتا ہوں۔

دوسری صورت کی توضیح اس مثال سے ہو سکتی ہے کہ ایک شخص اپنے گناہوں کا تصوّر کر کے کہے:

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْم	خدایا! بیشک تو ہی بخشنے والا مہربان ہے۔

تیسری صورت کی مثال یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ اَنَا الْمُذْنِبُ وَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ -	خدایا! میں گنہگار ہوں اور تو بخشش و مغفرت کرنے والا ہے۔

حضرت سفیانؒ سے سوال و جواب

سفیان بن عیینہؓ سے پوچھا گیا کہ ایک حدیث میں وارد ہے کہ عرفہ کے دن سب سے بہتر دعا یہ ہے:

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ لَہُ الْمُلْكُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔	خداوند تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یگانہ ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، بادشاہی بھی اُسی کی ہے اور حمد وثنا کا مستحق بھی وہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

حضرت سفیانؒ نے پہلے تو یہ حدیث قدسی ذکر فرمائی کہ:

من شغلہ ذکری عن مسألتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین۔	جس شخص کو میری یاد کی مشغولیت نے سوال کرنے سے غافل کر دیا ہو، میں اس کو تمام سائلوں سے زیادہ بخشش دیتا ہوں۔

اس کے بعد آپ نے امیہ بن الصلت کے ان اشعار کا حوالہ دیا جن میں اُس نے ابن جدعان کی مدح سرائی کی ہے: ؎

ءاذکر حاجتی ام قد کفانی حیاؤك ان شیمتك الحیاءُ اذا اثنی علیك المرء یومًا کفاہ من تعرضہ الثناءُ	میں نہیں جانتا کہ میں اپنی حالت کا اظہار کروں یا تیری بخشش کا دریا خود بخود موجزن ہو گا۔ کیونکہ بخشش تیری فطرت میں داخل ہے۔ جب بھی کوئی آدمی تیری مدح سرائی کرتا ہے تو پھر وہ طلب اور سوال کا محتاج نہیں رہتا۔

سفیانؒ نے یہ شعر پڑھ کر فرمایا "لو یہ ایک آدمی ہے جو اپنے جیسے ایک آدمی کی تعریف کر رہا ہے، اور خالق تعالیٰ کی شان تو اس سے بہت ہی بالاتر ہے۔"

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعائے ماثورہ بھی اسی نوع میں داخل ہے:

اَللّٰھُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَاِلَیْكَ	خدایا! تعریف وتحمید کا مستحق تو ہی ہے تیری طرف

اَلْمُشْتَکیٰ وَاَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَبِکَ الْمُسْتَغَاثُ وَعَلَیْکَ التُّکْلَانُ۔	میرا شکوہ ہے، تو ہی میرا پروردگار ہے ۔ تجھی سے میری فریاد ہے اور تجھی پر مجھے بھروسہ ہے ۔

حضرت ایوبؑ کی دُعاء حضرت ایوب علیہ السّلام کی تکلیف جب انتہا تک پہنچ گئی تو انہوں نے رفعِ شدت کے لئے ان الفاظ سے دُعا کی :

رَبِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ ۔ (۲۱ : ۸۳)	بارخدایا! مجھ کو سخت تکلیف پہنچی ہے اور تو سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے ۔

یہ کنایۃً سوال کرنے کی تیسری صورت ہے ۔ اس میں سائل نے اپنے حال کا بھی اظہار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ایک مناسبِ حال صفت کے ساتھ تعریف بھی کی ہے ۔ جس کے ضمن میں اس بات کی درخواست ہے کہ وہ اپنی رحمتِ کاملہ سے اس کی تکلیف کو رفع فرمادے ۔ اور یہ ایک پیرایۂ بیان خبریہ ہے جس میں معنوی طور پر سوال اور طلب شامل ہے ۔

پیرایۂ حُسنِ ادب اس قسم کے سوال میں حُسنِ ادب پایا جاتا ہے ۔ جیسا کہ کوئی شخص جو کسی کے ساتھ حسنِ ادب اور تواضع سے پیش آئے اور اُس سے کہے کہ میں بھوکا ہوں، میں بیمار ہوں ۔ اس سے اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے کھانا کھلاؤ اور میری دوا وعلاج کرو ۔

اسی طرح اگر الفاظ کے ذریعہ سے سوال کی طلب صادق اور سوال کی قطعیت کا تقاضا ہوگا، تو ضروری ہے کہ سائل کے حالات اور اُس کی پوزیشن کو واضح طور پر ظاہر کر کے بتلایا جائے کہ اس کا عجز ونکبت اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ اس کی حاجت برآری کرنا چاہیئے ۔ اور یہ بات پُوری توجہ سے کام لئے بغیر انجام نہیں پا سکتی ۔ اس لئے بفحوائے الکنایۃ ابلغ من التصریح[1] وہ سوال اور درخواست کی ایک مؤکد ترین

---

[1] حاشیہ آئندہ صفحہ پر دیکھو ۔

صورت ہے۔ البتہ صریح سوال اور صیغۂ طلب میں اپنے مقصد کا اظہار زیادہ واضح ہوتا ہے، اس لئے اکثر دُعاؤں میں یہی صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔

جامع ترین دُعاء

اس لئے اگر کوئی دُعا سائل اور مسئول دونوں کا حال بیان کر دینے پر مشتمل ہو گی تو وہ دعاء کی جامع ترین صورت ہو گی۔ کیونکہ ایسی دعاء سائل کے حال کی اطلاع اور مسئول کے حال کے علم کی حامل ہوتی ہے۔ جو دعاء کی قبولیت کی ضامن ہوتی ہے جیسا کہ صحیح بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ "مجھ کو کسی ایسی دعاء کی تعلیم دیجئے جس کو میں اپنی نماز میں پڑھا کروں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یہ دعاء سکھائی:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا كَثِیْرًا وَّلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِیْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَ ارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔	بار خدایا! میں نے اپنے نفس پر بہت ظلم کیا ہے اور تو ہی گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ اپنے ہاں سے مجھ کو مغفرت عنایت فرما، اور مجھ پر رحم کر، بے شک تو بخشنے والا مہربان ہے۔

اس میں سائل اپنے حال کا اظہار کرتا ہے کہ وہ مغفرت کا محتاج ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی یہ صفت بیان کرتا ہے کہ اس کے بغیر اور کوئی اس کی مطلب برآری پر قادر نہیں۔ اس کے بعد صریحاً اپنے مقصد کے متعلق درخواست ہے۔ اپنے رب کو مغفرت اور رحمت کی صفات سے موصوف ظاہر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اوصاف درخواستِ مذکور کو شرفِ قبولیت بخشنے کے مقتضی ہیں۔ اس قسم کی دعاء جامع ترین دعا سمجھی جاتی ہے۔

(نوٹ متعلقہ صفحہ ۲۸) یہ علم بیان کا ایک اصول ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی بات کو صریح نہ کہنا بلکہ کنایہ کے ساتھ کہنا جو بمقابلہ صریح اظہارِ مقصد کے بلیغ تر اور زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ (مترجم)

قرآنی دُعاؤں کا خاصہ

الغرض، دُعاء کی یہ تمام قسمیں استعمال میں آتی ہیں، اور قرآن کریم میں جو دعائیں مذکور ہیں، وہ تمام اقسام کی حامل ہیں، مثلاً موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول کہ :

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ۔ (۲۸: ۲۴)	اے میرے رب! جو کچھ نعمت بھی تو میری طرف نازل فرمائے، میں اس کا محتاج ہوں۔

اس میں اپنے حال کا اظہار کیا ہے۔ دوسری جگہ آپ کا یہ قول منقول ہے :

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ۔ (۲۸: ۱۶)	اے میرے رب! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے پس تو مجھے بخش دے۔

اس میں اپنا حال ظاہر کرنے کے علاوہ طلب مغفرت کی تصریح ہے ۔

تیسری دعاء حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سورۂ اعراف میں ان کی زبان سے نقل کی گئی ہے :

اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الْغَافِرِیْنَ۔ (۷: ۱۵۵)	تو ہی ہمارا سرپرست اور کارساز ہے، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔ تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے۔

اس میں مسئول کا حال بیان کیا گیا ہے جو اجابت کا مقتضی ہے اور ساتھ ہی طلب کی بھی تصریح ہے۔ بہرحال سوال کی یہ تمام تر قسمیں مستعمل ہیں اور ہر ایک قسم کی ایک خاص خصوصیت ہے ۔

باب ۲

درجۂ پذیرائیِ دعائے حضرت یونسؑ

فصل ۱

لفظ سُبحانک کا مفہوم

عدم تصریح مقصود اور کلام بلیغ

اب رہا یہ سوال[1] کہ یونس علیہ السلام نے کیوں اپنی دعا میں مقصد کی تصریح نہیں کی؟ اور صرف اپنا حال بیان کرنے پر کیوں اکتفا کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مناسب یہی تھا کہ اپنے حال کا اظہار کرنے پر اکتفا کیا جاتا۔ کیونکہ کلام بلیغ وہی ہوتا ہے جو اقتضائے مقام کے مطابق ہو۔

یہاں پر مقام کا اقتضاء، گناہ کا اعتراف اور اس بات کا اظہار ہے کہ جو مصیبت مجھ پر نازل ہوئی ہے، اس کا موجب میرا اپنا گناہ ہے۔ بسبب مغفرت ضمناً مطلوب ہے۔ اس لئے لفظ سوال سے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

رفع تکلیف کا حقیقی ذریعہ

حضرت یونسؑ جانتے تھے کہ وہ خطا رکار اور ستمگار ہیں اور اس تمام مصیبت کی علتِ حقیقی ان کا اپنا گناہ اور تقصیر ہے۔ اس لئے ظلم اور گناہ کا اقرار کرنا اور اس پر ندامت کا اظہار کرنا ہی رفعِ سبب کا موجب ہوگا، جو زوالِ مصیبت اور رفعِ تکلیف کا حقیقی علاج ہے۔ اس کی مزید

[1] یہاں سے سوال نمبر ۴ کا جواب شروع ہوتا ہے۔

توضیح لفظ "سبحانک" کی تشریح سے ہو سکتی ہے۔

اعترافِ عظمتِ الٰہی

سُبْحَانَكَ میں اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ (ہر ایک عیب اور نقص سے پاک اور مبرا ہونا) اور اس کی عظمت کا اعتراف ہے۔

بلحاظ مقام کے اس کی تنزیہہ کا یہ مفہوم ہے کہ اس کی ذاتِ پاک اس سے منزہ اور برتر ہے کہ کسی پر ظلم کرے یا بغیر کسی گناہ اور قصور کے کسی پر عقوبت اور عذاب نازل فرمائے۔ قائل اس بات پر زور دیتا ہے کہ خدایا! تو پاک اور بے عیب ہے، اس بات سے کہ بغیر کسی جرم اور قصور کے مجھ پر ظلم کرے اور عذاب میں مبتلا کرے، بلکہ میں خود ہی ظالم تھا جس نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے۔ قرآن کریم میں اس حقیقت کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے:

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ - (۱۶ : ۱۱۸)

خدا نے ان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ تو خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا کرتے تھے۔

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ - (۱۱ : ۱۰۱)

خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ تو خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا کرتے ہیں۔

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ - (۴۳ : ۷۶)

خدا نے ان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ظالم تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ - (۱۰ : ۴۴)

بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام بھی اپنی دعاء میں اسی حقیقت کا اعتراف کیا ہے:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ - (۷ : ۲۳)

بارخدایا! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہم پر مغفرت اور رحمت نہ کی تو ہم زیاں کاروں میں سے ہو جائیں گے۔

استفتاح نماز کی دُعا

صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفتاح (آغازِ نماز) کی دُعا اِن الفاظ میں منقول ہے :

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْمَلِکُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ، اَنْتَ رَبِّیْ وَاَنَا عَبْدُکَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ جَمِیْعًا فَاِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ ۔

الٰہی! تُو ہی شہنشاہ ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو ہی میرا پروردگار ہے اور میں تیرا غلام ہوں میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور میں اب اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ پس تو میرے تمام گناہ بخش دے۔ بیشک تیرے سوا گناہ بخشنے والا کوئی نہیں ہے۔

سیدالاستغفار کی فضیلت

صحیح بخاری میں سیدالاستغفار کی یہ عبارت آئی ہے کہ آدمی یوں کہے :

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُکَ وَاَنَا عَلٰی عَھْدِکَ وَوَعْدِکَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَکَ بِنِعْمَتِکَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ ۔

یا رخدایا! تو میرا رب ہے سوائے تیرے اور کوئی معبود نہیں، تُو نے ہی مجھے پیدا کیا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں، اور جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں تیرے عہد و پیمان اور وعدے پر قائم رہا ہوں، جو برائیاں میں نے کیں اُن کے شر سے تجھی سے پناہ مانگتا ہوں میں اپنے اوپر تیری نعمتوں کا اعتراف کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا بھی مجھے اقرار ہے۔ اے خدا! تو مجھے بخش دے، بیشک تیرے سوا اور کوئی نہیں جو گناہوں کا بخشنے والا ہو۔

اس کی بابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ جس شخص نے صبح کے وقت اس کو پڑھا، بشرطیکہ اُسے ان الفاظ پر یقین ہو، اور پھر وہ اسی دن مر جائے، تو وہ جنت میں داخل ہوگا، اور جس شخص نے اس کو شام کے وقت پڑھا، بشرطیکہ اُس

کو ان الفاظ پر یقین ہو، اور پھر وہ اس رات میں مر جائے، تو وہ جنت میں داخل ہو گا۔

عدل اور احسانِ خداوندی کا اعتراف

الغرض آدمی کو چاہیئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عدل اور احسان کا اعتراف کرے۔ کیونکہ وہ کسی پر بھی ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا، اور کسی کو بغیر اس کے اپنے کئے ہوئے جرم کے سزا نہیں دیتا۔ اس کے احسانات اور بندہ نوازیوں کا سلسلہ غیر منقطع ہے۔ اس کی طرف سے جو عقوبت اور عذاب نازل ہو، وہ عین عدل ہے، اور اگر وہ کسی کو اپنی نعمتوں سے سرفراز فرمائے، تو یہ اس کا احسان اور فضل ہے۔

فصل ۲

اُلوہیتِ الٰہی کا اعتراف

لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ کا مفہوم

لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ کے یہ معنی ہیں کہ خدائے تعالیٰ اپنی اُلوہیت کے اوصاف میں بے ہمتا ہے۔ اُس کا علم ہر ایک چیز پر محیط ہے، اس کی قدرت ہر ایک بات کو شامل ہے، اس کی رحمت بے پایاں ہے اور اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ اس کی الوہیت کے اعتراف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اپنے بندوں پر متواتر اپنے احسانات نازل فرماتا ہے کیونکہ اس کی اُلوہیت کے یہ معنی ہیں کہ وہ عبادت کا مستحق ہے۔ جس کا بہ الفاظ دیگر یہ مفہوم ہے کہ وہ ان تمام صفات کاملہ کے ساتھ موصوف ہے، جن کی وجہ سے وہ اپنے بندوں کے لئے انتہا درجہ کا محبوب ہے اور اُن کے دلوں میں اس کی بے حد عظمت ہے، اور وہ اس کے سامنے بے انتہا خضوع کرتے ہیں۔

عبادت کے مفہوم میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں : انتہا درجے کی محبت اور انتہا درجے کا خضوع۔

تصورِ مدح سرائی سُبحَانَکَ کے یہ معنی ہیں کہ وہ ظلم اور دیگر نقائص و عیوب سے پاک اور منزہ ہونے کے علاوہ اجلال اور اعظام کا مستحق ہے۔ کیونکہ اگرچہ تسبیح کا سادہ مفہوم اُس کی (ذاتِ پاک کا) نقائص اور عیوب سے مبرا ہونا ہے۔ جیسا کہ مرسل حدیثوں میں موسیٰ بن طلحہؓ کی ایک حدیث میں روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فِیْ قَوْلِ الْعَبْدِ سُبْحَانَ اللّٰہِ اَنَّھَا بَرَآءَۃُ اللّٰہِ مِنَ السُّوْءِ ۔	آدمی کے سبحان اللہ کہنے کا مفہوم ہر بُرائی سے اللہ تعالیٰ کی برأت کا اظہار ہے۔

لیکن فقط نفی کبھی مدح نہیں تصور کی جاتی ہے، جب تک اس کے ضمن میں کمال کا اثبات نہ ہو۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ تسبیح کے مفہوم میں اس کی عظمت اور جلال کا مفہوم بھی شامل ہے۔ قرآن کریم میں عموماً جہاں کہیں اللہ تعالیٰ سے کسی عیب اور نقص کی نفی کی گئی ہے، ساتھ ہی اس کی صفاتِ کاملہ اور اس کے اسماءِ حسنیٰ کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً ارشاد ہے:

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَا نَوْمٌ (۲: ۲۵۵)	اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں، وہی زندہ اور تمام کائنات کو قائم رکھنے والا ہے۔ اُسے نہ کبھی اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

گویا اونگھ اور نیند کی نفی اس کی حیات اور قیومیت کے کمال کا موجب ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ۖ وَّمَا	بیشک ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان میں کی تمام مخلوقات کو چھ دن میں پیدا کیا اور ہمیں

مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ۔ (۵۰ : ۳۸) | کچھ بھی تکان محسوس نہ ہوئی۔

پس معلوم ہوا کہ تکان کا محسوس نہ ہونا اس کے کمالِ قدرت کی دلیل ہے۔

صدورِ ظلم کا عدمِ امکان

الغرض حضرت یونس علیہ السّلام کے قول سُبْحَانَکَ میں اللہ تعالیٰ سے ظلم کی نفی کی گئی ہے اور ساتھ ہی اس کی عظمت کا اثبات ہے، جو نفیِ ظلم کے لئے بمنزلہ دلیل کے ہے۔ کیونکہ جو شخص ظلم کرتا ہے، یا تو وہ اس کا محتاج ہوتا ہے، یعنی اس کا مقصد بغیر ظلم کے پورا نہیں ہوتا۔ اور یا اس کا باعث اس کی جہالت ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ غنی و بے نیاز ہے اور اُس کا علم ہر ایک چیز پر محیط ہے۔ اس لئے اس سے ظلم کا صادر ہونا ممکن نہیں۔

وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظْلِمَھُمْ۔ (۲۹ : ۴۰) | اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم کرے

فصل ۳

وجہ فضیلتِ دُعائے حضرت یونسؑ

افضل الکلام

حضرت یونس علیہ السّلام کی اِس دعاء کی ایک فضیلت یہ ہے کہ اس میں تسبیح اور تہلیل کو جمع کیا گیا ہے۔ اور حدیث صحیح میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ قرآن کریم کے بعد بہترین یہ چار کلمات ہیں: سُبْحَانَ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ"۔ لیکن تم جانتے ہو کہ تسبیح کے ساتھ تحمید گویا لازم ہے۔ اسی طرح تہلیل اور تکبیر کا ساتھ ہے۔

نیز ایک صحیح روایت ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم سے افضل کلام کی بابت دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا:

اَفْضَلُ الْکَلَامِ مَا اصْطَفَی اللّٰہُ | افضل کلام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے

لِلْمَلَائِکَتِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ | لئے اپسند فرمایا ہے یعنی وہ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ ہے۔

صحیحین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ :

کَلِمَتَانِ خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ، حَبِیْبَتَانِ اِلَی الرَّحْمٰنِ : سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔ | دو ایسے کلمے ہیں جو زبان پر نہایت ہلکے (آسان) ہیں مگر قیامت کو ترازو میں بہت وزنی ہونگے اور وہ دونو اللہ تعالیٰ کو بہت پیارے ہیں (وہ یہ ہیں :) ۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ ۔

ان دونوں کلمات میں خدا کی تسبیح کو اُس کی حمد اور اُس کی عظمت کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ تسبیح کے مفہوم میں نقائص اور عیوب کی نفی کے علاوہ عظمت و جلال اور صفات کمال کا بھی اثبات ہے ۔

قرآن کریم میں ایک جگہ حکم دیا ہے :

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ (۱۶ : ۹۹) | اپنے پروردگار کی حمد بیان کرو ۔

فرشتوں نے جواب دیا تھا :

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (۲/۳) | خدایا ! ہم تیری حمد و تقدیس کے گیت گاتے ہیں ۔

محامدِ ذات کی محبوبیت

گویا جس طرح خدا کی حمد و تعظیم کو یہاں یکجا بیان کیا ہے اُسی طرح بعض دوسری جگہوں میں اجلال و اکرام کی صفت کو جمع کیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ عظمت اور کبریائی کے ساتھ موصوف ہونے کے باوجود اپنے محامدِ صفات کی وجہ سے اپنے بندوں کو نہایت ہی محبوب ہے۔ برخلاف اس کے بعض محبوب ایسے ہوتے ہیں، جن کی عظمت دلوں میں کچھ نہیں ہوتی - اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جس کی دل میں عظمت ہے، وہ محبوب بھی ہو - لیکن باوجودیکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کا کچھ ٹھکانا نہیں، پھر بھی وہ اپنے محامدِ صفات کی وجہ سے بدرجۂ غایت محبوب ہے۔ ذوالجلال والاکرام کے یہی معنی ہیں - اور عبادت کی بھی یہی

حقیقت ہے کہ معبود کی عظمت اس کی محبت کے ساتھ ملی جلی ہوئی ہو، جیسے کہ ہم پہلے اس کی توضیح کر چکے ہیں۔

غلطیٔ امام رازیؒ امام فخر الدین رازیؒ اور بعض دوسرے مفسرین کا قول ہے کہ "جلال صفت سلبیہ ہے اور اکرام صفتِ ثبوتیہ" لیکن یہ اُن کی غلطی ہے۔ تحقیقی بات وہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے کہ یہ دونوں صفات ثبوتیہ ہیں۔ اور صفاتِ کمال کا اثبات بھی نفی نقائص کا موجب ہے، جیسا کہ اس کی تنزیہہ صفاتِ کمال کے اثبات کی مرادف ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مفہوم میں نقائص اور عیوب کی نفی بھی پائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس سے محبت کی جائے اور وہی عظمت و تعظیم کے لائق ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (—) | بالشبہ اللہ تعالیٰ ہی بے پرواہ اور ستودہ صفات ہے۔

اور سلیمان علیہ السلام کا قول:

فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ (—) | بیشک میرا پروردگار ہی بے پرواہ اور کریم ہے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (—) اسی کے لئے بادشاہی ہے اور اسی کے لئے تعریف۔

کیونکہ بکثرت صاحب کمال و عظمت ایسے ہوتے ہیں جو حمد کے لائق نہیں ہوتے، بلکہ قابلِ مذمت ہوتے ہیں۔ اور بکثرت محبوب ایسے ہوتے ہیں جنہیں اس لحاظ سے کوئی عظمت نصیب نہیں ہوتی، بلکہ نہایت عاجز، ذلیل اور ضعیف ترین انسان شمار کئے جاتے ہیں۔ اوّل الذکر سے محبت نہیں کی جاتی، بلکہ اس کے رُعب داب سے ڈرا جاتا ہے جو لائقِ محبت نہیں۔

عظمت و کبریائی کا اظہار کمالِ محبت اس وقت حاصل ہوتا ہے جب یہ دونوں اوصاف جمع ہو جائیں جیسا کہ آثارِ صحابہ میں ہے:

اقامت کے الفاظ مشروعہ اور دیگر ادعیہ ماثورہ میں جا بجا اللہ تعالیٰ کو کبریائی کے ساتھ موصوف ظاہر کیا گیا ہے۔

ایک صحیح روایت سے یہ حدیث قدسی منقول ہے "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میرا تہبند ہے۔ جو کوئی ان صفات میں میرے ساتھ جھگڑا کریگا (یعنی اپنے آپ کو ان صفات سے موصوف ظاہر کرنے کی کوشش کریگا) میں اس کو عذاب دونگا۔" اور ایک روایت میں ہے " اس کو توڑ ڈالوں گا۔"

ظاہر ہے کہ عرب کے نزدیک چادر کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ لہٰذا عبارتِ مذکور میں کبریائی کو چادر سے تعبیر کرنا ایک پیرایۂ بیان ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کبریائی کے مفہوم میں بڑائی کا مفہوم بہت زیادہ ہے۔

اسمائے حسنیٰ اور کلماتِ چہارگانہ

ان کلماتِ چہارگانہ میں سے جب ہر ایک کلمہ الگ استعمال ہو تو وہ دوسرے کلمات کے مفہوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور اگر دوسرے کلمات کے ساتھ مقرون ہو کر استعمال ہو تو پھر ہر ایک کلمہ اپنے خاص مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اسمائے حسنیٰ میں سے ہر ایک اسم دوسرے اسماء کے مفہوم پر ضمناً مشتمل ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک اسم میں ذات کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اس کی ذات تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے۔ لیکن اگر ساتھ ساتھ دو یا تین یا زیادہ اسمائے حسنیٰ مذکور ہوں تو ہر ایک اسم اپنا خاص مفہوم ظاہر کرتا ہے۔

مدحت طرازی بدرجۂ غایت

اس بناء پر حضرت یونس علیہ السلام کا یہ قول کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ کلماتِ چہارگانہ کے معانی پر مشتمل ہے۔ جن کو قرآن کریم کے بعد دوسرے درجہ پر افضل الکلام بتایا گیا ہے، اور اس کے ضمن میں تمام اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ علیا کا مفہوم شامل ہے۔ اس

لئے یہ غایت درجہ کی مدح ہے۔

اظہارِ حال و اعترافِ قصور

اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ میں اپنے حال کا اظہار اور گناہ اور قصور کا مؤکد اعتراف ہے۔ یہ ایک ایسا اعتراف ہے جو ہر ایک فردِ بشر کے لئے ناگزیر ہے، خصوصاً جبکہ وہ اپنے پروردگار کے ساتھ مناجات میں مشغول ہو۔ بروایتِ صحیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول منقول ہے کہ:

لَا یَنْبَغِیْ لِعَبْدٍ اَنْ یَّقُوْلَ: اَنَا خَیْرٌ مِّنْ یُّوْنُسَ ابْنِ مَتّٰی۔	کسی شخص کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں کہ میں یونس بن متیؑ سے اچھا ہوں۔
مَنْ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ یُّوْنُسَ ابْنِ مَتّٰی فَقَدْ کَذَبَ۔	جو شخص یہ کہے کہ میں یونسؑ بن متی سے اچھا ہوں، وہ اپنے اس قول میں جھوٹا ہے۔

ایک دلچسپ توجیہ

اس حدیث شریف کا ملخص یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو اس سے بالاتر سمجھتا ہے کہ وہ یونس علیہ السلام کی طرح صریح اور صاف لفظوں میں اپنے گناہ کا اعتراف کرے، بے شک وہ جھوٹا ہے۔ اِس لئے بزرگانِ دین میں سے کسی نے بھی اپنے آپ کو اس مقام سے بری قرار نہیں دیا، بلکہ وہی کہتے رہے جو اُن کے باپ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا، اور ان کے پیشوا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا۔

آیت کریمہ ۲

باب ۳

خاصیت و حکمت دعائے یونس ؑ

فصل ۱

کتاب و سنّت کی روشنی

سبب اور ازالۂ مصیبت

اب رہا سائل کا[1] یہ قول کہ اس سے مصیبت دُور ہونے میں کونسی حکمت ہے؟ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ اس میں کونسی حکمت ہے! مصیبت کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی دُور نہیں کرسکتا۔

کلام پاک میں ہے:

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۔ (۱۰ : ۱۰۷)

اگر اللہ تعالیٰ تم کو کوئی تکلیف پہنچا دے تو سوائے اس کے اور کوئی بھی نہیں جو اُسے دُور کر سکے۔ اور اگر وہ تم کو بھلائی پہنچانا چاہے تو کوئی بھی اس کے فضل کو روکنے والا نہیں۔

یہ بھی ایک مسلّمہ امر ہے کہ ہر ایک تکلیف اور مصیبت کا حقیقی سبب انسان کے اپنے گناہ ہوتے ہیں۔ فرمایا:

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۔ (۴۲ : ۳۰)

تم کو جو کچھ بھی تکلیف پہنچتی ہے، وہ تمہارے اپنے کئے ہوئے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اور اللہ تو بہت سے گناہ بخش بھی دیتا ہے (اور اُن پر مواخذہ نہیں کرتا)

---

[1] یہاں سے سوال نمبر ۲ کا جواب شروع ہوتا ہے۔ (ناشر)

اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے اس سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرنا ازالۂ سبب کا حکم رکھتا ہے۔ فرمایا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۔ (۸ : ۳۳)

یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ اُن میں موجود ہوں اور اللہ تعالیٰ اُن کو عذاب دے، اور یہ بھی ناممکن ہے کہ اُن کو بخشش طلب کرنے پر عذاب میں مبتلا کر دیا جائے۔

پس اس بات سے خبردار ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ اپنے گناہوں سے بخشش مانگنے والے کو عذاب نہیں کرے گا۔

ہر تنگی اور اندیشے سے نجات

حدیث شریف میں ہے کہ

مَنْ اَكْثَرَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهٗ مِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا وَمِنْ كُلِّ ضِيْقٍ مَخْرَجًا وَرَزَقَهٗ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۔

جو شخص کثرت سے اپنے گناہوں کیلئے مغفرت طلب کرتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ہر اندیشے سے نجات بخشتا ہے اور ہر ایک تنگی سے نکلنے کا اس کے لئے راستہ بنا دیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں سے وہم و گمان بھی نہ ہو۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کے قول میں کہاں تک اِن اُصول کی پابندی اور ان پر عمل کیا گیا ہے؟

خیر و برکت کا سرچشمہ

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں توحید الوہیت کا اقرار اور اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ میں اپنے گناہ اور قصور کا اعتراف ہے۔ جس کے ضمن میں طلب مغفرت پائی جاتی ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ تمام خیر و برکت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور اس کی مشیئت ہے، جو چاہے سو کرے۔ اور جس چیز کو وہ نہ چاہے، اُس کا ہونا محال اور ناممکن ہے لیکن اس خیر و برکت کے نزول سے آدمی کے

اپنے گناہ مانع ہوتے ہیں۔ اس لئے توحیدِ الوہیت کی شہادت انسان کے لئے خیر کا دروازہ کھول دیتی ہے اور استغفار سے شر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے اپنی اُمید و بیم کو وابستہ رکھے اور اس بات کا خوف کبھی اُس کے دل میں پیدا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اُس پر ظلم کریگا (والعیاذ باللہ) ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔ (۱۰ : ۴۴)	بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا، لیکن لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

بلکہ اُسے اس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ اس کے اپنے گناہ اس کے لئے عذاب کا موجب نہ بن جائیں۔

حضرت علیؓ کا قول

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ "لا یرجون عبد الا ربہ ولا یخافن الا ذنبہ۔ (انسان کو صرف اپنے خدا ہی سے امید و بیم کی لو لگانا چاہیئے اور فقط اپنے گناہوں سے اُسے ڈرنا چاہیئے)۔

اُمید و بیم کا ملجا و ماویٰ

ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بیمار کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے آپؐ نے اُس سے دریافت فرمایا: کیف تجدک؟ (تم اپنے کو کس حالت میں پاتے ہو؟) اس نے جواب میں عرض کیا کہ: ارجو اللہ رحمتہ واخاف ذنوبی (اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار ہوں اور اپنے گناہوں سے ڈرتا ہوں)۔ آپؐ نے فرمایا:

ما اجتمعا فی قلب عبد مثل ھذا المومن الا اعطاہ اللہ ما یرجوو امنہ مما یخاف۔	ایسے موقع پر جس مومن کے دل میں خوف و رجاء جمع ہوں یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی اُمید بر لائیگا اور جس چیز سے وہ ڈرتا ہے اس سے اس کو بے غم کر دیگا۔

بہرحال انسان کی اُمید صرف اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہونی چاہیئے، کسی دوسری مخلوق کے ساتھ نہ ہو، حتیٰ کہ اپنی قوت اور اپنے عمل کے ساتھ بھی اپنی امیدوں کو وابستہ نہ کرے، کیونکہ ایسا کرنا شرک ہے، جس کو اللہ تعالیٰ کبھی پسند نہیں فرماتا۔

موجب اثرات اسباب

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے حصول کے لئے اسباب مقرر فرمائے ہیں۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اسباب بذاتِ خود کچھ بھی مُوثر نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اُن کے اثر کو باطل کر دے۔ فرمایا:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ (۱۳ : ۳۹)	اللہ تعالیٰ جس چیز کے اثر کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کے اثر کو چاہتا ہے، قائم رکھتا ہے اور اس میں تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔

اسباب عدم ظہور نتائج

نیز بعض اوقات یا اکثر اوقات موانع اور عوارض کی وجہ سے اسباب کے عمل میں لائے جانے کے باوجود مطلوبہ نتائج ظہور میں نہیں آتے، اور ان عوارض اور عوائق و موانع کا دُور کرنا اللہ تعالیٰ کی مشیئت پر موقوف ہے۔ اسی بناء پر کسی بزرگ نے کہا ہے کہ "اسباب پر نظر رکھنا شرک ہے، لیکن اسباب سے بالکل قطع نظر کر لینا اور ان پر مطلق التفات نہ کرنا بھی عقل اور شرع کے خلاف ہے۔ کلام پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ (۹۴ : ۸،۷)	جب تم دوسرے مشاغل سے فارغ ہو جایا کرو تو تکلیف برداشت کرو اور صرف اپنے پروردگار کی طرف راغب ہوا کرو

اس آیت میں اس بات کا حکم ہے کہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رغبت رکھنا چاہیئے دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۵ : ۲۳)	تم اگر مومن ہو تو صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو۔

فصل ۲

کامرانی کی حقیقی شاہراہ

توکّل علی اللہ اور شرک

انسان کا بھروسہ ہمیشہ اس چیز پر ہوتا ہے جس سے اس کی اُمیدیں وابستہ ہوں۔ اس لئے جس شخص کی اُمیدیں اپنے زورِ بازو، اپنے علم و عمل، اپنے حال یا اپنے دوست، اپنی قرابت یا اپنے مال و دولت، اپنے پیر و استاد یا بادشاہ کے ساتھ وابستہ ہوں اور وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہو، تو سمجھو کہ وہ ان چیزوں پر بھروسہ رکھتا ہے اور اس کا توکّل اُن چیزوں پر ہے لیکن یہ شرک ہے۔ فرمایا:

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۔

جو شخص اللہ سے شرک کرتا ہے تو اس کی مثال یہی ہے جیسے وہ آسمان سے گر کر مر گیا اور پرندے اس کا گوشت نوچتے ہیں یا ہوا اُسے دُور دراز مقام پر اڑا کر لے جائے

مخلوق پر بھروسہ

جو شخص کسی مخلوق سے اپنی اُمیدوں کو وابستہ کرتا ہے یا حصولِ مقصد کے لئے اس پر بھروسہ رکھتا ہے، اس کا انجام ناکامی ہوگا اور جلد یا بدیر اس کی یہ غلط فہمی دُور ہو کر رہیگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا

بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو اُس کا شریک بناتے اور اُن سے خدا کی طرح محبت رکھتے ہیں لیکن جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی محبت میں بہت زیادہ سرشار ہیں۔ اور اگر یہ ظالم لوگ اس حالت کو دیکھ

اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۭ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ۔ (۲: ۱۶۵ تا ۱۶۷)

پس جب کہ عذاب ان کو سامنے نظر آجائیگا تو انہیں اور زیادہ یقین ہو جائے کہ تمام تر طاقت اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے اور بیشک اللہ کا عذاب نہایت سخت ہے۔ یہ وہ حالت ہے جبکہ پیشوا اپنے مریدوں سے بیزاری کا اظہار کرینگے اور عذاب ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگا اور جن اسباب پر ان کو بھروسہ تھا وہ سب منقطع ہو جائینگے۔ پیروی کرنے والے مرید کہیں گے: کاش! اگر ہمارے لئے بھی دوبارہ (دنیا میں) لوٹ جانا میسر ہو جائے تو ہم بھی ان (پیشواؤں) سے اسی طرح دستبردار ہو جائیں جس طرح وہ ہم سے دستبردار ہوئے۔ اس طرح اللہ ان کے اعمال بد انہیں دکھاتا ہے کہ ان پر حسرت طاری ہو۔ بہرحال انہیں دوزخ کی آگ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

اور فرمایا:-

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا۔

(۱۷: ۵۷)

(اے نبی! مشرکوں سے) فرمادیجئے: اللہ کے سوا جن کو تم خدا سمجھتے ہو، ان کو بلاؤ۔ وہ تم سے مصیبت رفع کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور نہ ہی بدلہ دے سکتے ہیں۔ وہ تو خود بھی اپنے پروردگار کو بلاتے اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ ان میں سے کون اس سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف رہتے ہیں۔ بلاشبہ تیرے پروردگار کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے۔

مشرک مرعوب اور مومن مأمون

یہ مشرکوں کی ایک خاص صفت ہے کہ اُن کا ڈرنا اور ان کی اُمید و بیم مخلوق سے وابستہ ہوتی ہے۔ اور اس لئے وہ ہمیشہ مرعوب رہتے ہیں۔ کلام پاک میں ہے:

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَکُوْا بِاللّٰہِ۔ (۳ : ۱۵۱)	ہم ان کافروں کے دلوں میں اس لئے رُعب ڈال دیں گے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنا دیا۔

اس کے برخلاف جس کی توحید خالص ہے' وہ امن میں رہتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ ۔ (۶ : ۸۲)	جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کا جامہ نہیں پہنایا' ان کے لئے امن وامان ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں ۔

اس آیت میں لفظ ظلم کی تفسیر شرک کے ساتھ کی ہے۔ نیز ایک صحیح اور مرفوع حدیث میں منقول ہے جو ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ جب آیت نازل ہوئی تو صحابہ متردد ہوئے کہ کون ہے جو اپنے نفس پر ظلم نہیں کرتا؟ تو آپ نے فرمایا: اِنَّ ھٰذِہٖ الشِّرْکُ، یعنی اس سے مراد شرک ہے۔ اور اس کی تائید میں آپ نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی اور فرمایا: کیا تم نے یہ نہیں سُنا:

اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (۳۱/۱۳)	شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے۔

اس نکتہ کو ملحوظ خاطر رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ اسباب کا ذکر فرماتے ہوئے اس بات کی تصریح فرماتا ہے کہ اُن مشرکوں پر اعتماد نہ کیا جائے۔ بلکہ ایک ایماندار کی یہ صفت ہونی چاہئے کہ اس کا تمام تر بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر رہے۔

جنگ بدر اور اسباب فتحمندی

جنگِ بدر میں ملائکہ کے نزول کا ذکر فرماتے ہوئے کلام پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی لَکُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُکُمْ بِهٖ، وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ۔ (۳ : ۱۲۶)

ملائکہ کا نزول فقط تم کو خوش کرنے کے لئے تھا، اور یہ کہ تمہارے دل تسلی پذیر ہوجائیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ فتحمندی اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہے، جو غالب اور حکمت والا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ کَثِیْرَةٍ وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْکُمْ شَیْئًا وَّضَاقَتْ عَلَیْکُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ، ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَکِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا، وَذٰلِکَ جَزَآءُ الْکٰفِرِیْنَ۔ (۹ : ۲۶)

بیشک اللہ تعالیٰ نے تم کو بہت سے میدانہائے جنگ میں فتحمندی عنایت کی اور جنگ حنین کے موقع پر بھی تم کو فتحمند کیا، جبکہ تم اپنی کثرت پر نازاں تھے لیکن تمہاری کثرت تمہارے ذرہ بھی کام نہ آئی اور زمین باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہوگئی اور بالآخر تم بھاگ نکلے۔ ازاں بعد (جبکہ تم پر اسباب ظاہری کی حقیقت روشن ہوگئی) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مومنوں پر تسلی نازل فرمائی اور ایسے لشکر ان کی مدد کے لئے بھیجے جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے[1] اور اس نے کافروں کو عذاب دیا اور یہی اُن کی سزا ہے۔

تیسری جگہ فرمایا ہے:

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (۳ : ۱۵۹)

اگر اللہ تعالیٰ تم کو فتحمند بنانا چاہے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمہاری مدد چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کریگا اور مومنوں کو تو صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔

---

[1] یہ اس بات کی تصریح ہے کہ تم کو فتحمندی غیر مرئی اسباب کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے۔

فصل ۳

صبر اور توکل کا موازنہ

امید و بیم بھی سوال کی ایک قسم ہے

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ دعا کی دو قسمیں ہیں: ایک دعاء بمعنی عبادت ہے اور دوسری دعا بمعنی سوال۔ اور دعا کی یہ دونوں قسمیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہیں جس کسی نے کسی دوسری ہستی کو حاجت روا گردانا تو وہ ذلیل و خوار ہو گیا اور چونکہ کسی سے اپنی اُمید کو وابستہ کرنا بھی سوال کی ایک قسم ہے، اس لئے یہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے، اُسے چاہیئے کہ کسی دوسرے سے سوال نہ کرے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما اتاك من هذا المال وانت غير سائل ولا مشرف فخذه وما لا تتبعه نفسك۔	جو مال تم کو ایسی حالت میں ملے کہ تم نے نہ تو سوال کیا ہو اور نہ تم اس کے نگراں رہے ہو، اُس مال کو لے لیا کرو اور اگر ایسا نہیں تو مت لو۔

نگراں رہنے کے یہی معنی ہیں کہ آدمی اپنے دل میں اس مال کے مل جانے کا خواہاں ہو اور اس کی توقع رکھتا ہو۔

ابو سعید خدریؓ کی روایت

صحیحین میں ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک مرتبہ بھوک کی مصیبت میں مبتلا ہوئے اور میں سوال کرنے کے ارادہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ خطبہ میں مشغول تھے اور یہ فرما رہے تھے کہ:

ایها الناس! والله مهما یکن عندنا	اے لوگو! خدا کی قسم، اگر ہمارے پاس مال موجود ہوگا

من خیر فلن ندخرہ عنکم وانہ من یستغن یغنہ اللہ ومن یستعفف یعفہ اللہ ومن یتصبر یصبرہ اللہ وما اعطی احد عطاء خیرا اوسع من الصبر۔

تو میں ہرگز تم کو اس سے محروم نہیں کروں گا۔ اور بیشک جو شخص بے نیازی اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بے نیاز کر دیتا ہے، اور جو شخص اس ذلت سے بری رہنا چاہتا ہے، اللہ اس کو بری رہنے کی توفیق بخشے گا، اور جو شخص تکلیف برداشت کر کے صبر اختیار کرے گا، اس میں صبر کا ملکہ پیدا ہوگا اور صبر سے فراخ تر اور وسیع و بہتر بخشش کسی کو نہیں دی گئی۔

استغناء، یعنی بے نیازی، کے یہ معنی ہیں کہ اپنے دل کو بھی کسی چیز کی توقع میں نگراں نہ رکھے، اور اس کے حاصل کرنے کی خواہش ہی پیدا نہ ہو۔

اور استعفاف یعنی بری رہنا، یہ ہے کہ زبان سے سوال نہ کرے۔

امام احمد بن حنبل رح کا توکل

یہی وجہ ہے کہ جب امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے توکل کی حقیقت دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا:

قطع الاستشراف الی الخلق۔ | مخلوقات سے اپنی اُمید و بیم کو توڑ دینا۔

یعنی توکل یہ ہے کہ تمہارے دل میں بھی یہ خیال پیدا نہ ہو کہ کوئی تم کو کچھ دے گا اس کی دلیل کی بابت استفسار کیا گیا تو آپ نے فرمایا: جب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کافروں نے آگ میں ڈالا اور جبرئیل علیہ السلام نے آ کر کہا:

ھل لك من حاجة ؟ | آپ کو کسی چیز کی حاجت ہو تو فرمائیے!

حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

ما الیک | تمہاری طرف سے تو مجھے کوئی حاجت نہیں۔

ایسی روایات سے صاف اور واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو کسی نفع کی طلب میں یا کسی ضرر کے ارتفاع میں اپنا دل سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی طرف متوجہ نہیں

کرنا چاہئے۔ اسی بنا پر یونس علیہ السلام نے اپنی دُعا کو لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سے شروع کیا۔

ارشادِ نبوی بروقتِ تکلیف

صحیح بخاری اور مسلم میں بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی مصیبت اور تکلیف کے پیش آنے پر فرمایا کرتے تھے :

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْعَظِیْمُ الْحَلِیْمُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ۔

بیشک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عظمت اور حلم کا خداوند ہے۔ بیشک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہی بڑے عرش کا مالک ہے۔ بیشک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے اور عزت والے عرش کا مالک ہے۔

ان الفاظ میں سراسر توحیدِ اُلوہیت کا اظہار ہے، اور یہ کہ مومن کی جملہ امیدیں اسی وحدہٗ لاشریک لہٗ کے ساتھ وابستہ ہیں (تبارک وتعالیٰ ربّ العالمین واحسن الخالقین)۔

یہ الفاظ بظاہر جملہ خبریہ ہیں، لیکن ان کے ضمن میں طلب کے معنی پائے جاتے ہیں۔ جیسے کہ بارہا اس کا ذکر ہوا ہے۔

فصل ۴

اخلاص اور عُلوّ شانِ اُلوہیت

پابندیٔ احکام واطاعت

عام لوگ اگرچہ اپنی زبان سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتے اور توحیدِ اُلوہیت کا اقرار کرتے ہیں، لیکن خلوص کے ساتھ اس کی حقیقت کا اعتراف کرنے کی شان دوسری ہے۔ کمالِ توحید کا لازمی نتیجہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی اور اطاعت ہے۔ کلام مجید میں ہے :

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ اَفَاَنْتَ تَکُوْنُ عَلَیْہِ وَکِیْلًا، اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَکْثَرَھُمْ یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ اِنْ ھُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا۔ (۲۵: ۴۳، ۴۴)

کیا کبھی تم نے اُس شخص کے حال پر بھی غور کیا، جس نے ہوائے نفس کو اپنا معبود قرار دے رکھا ہے؟ کیا تم اُس شخص کے وکیل ہو اور کیا تمہارا خیال ہے، کہ اکثر ان میں سے سن سمجھ سکتے ہیں؟ یہ لوگ تو یقیناً چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ اُن سے بھی گمراہ تر۔

ہوائے نفس کو معبود ٹھہرانا

اس لئے جس کسی کی محبت اور شیفتگی اپنی خواہشاتِ نفسانی کے لئے ہو، اُس نے یقیناً ہوائے نفس کو اپنا معبود قرار دیا۔ اور یہی کیفیت مشرکوں کی ہے کہ جس چیز کو انہوں نے اپنی خواہش نفس کے مطابق پسند کیا، اسی کو اپنا معبود بنا لیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ۔ (۲: ۱۶۵)

یہی لوگ ہیں، جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنا رکھے ہیں، جن کے ساتھ وہ خدا کی طرح محبت کرتے ہیں۔

اخلاصِ حضرت ابراہیم خلیل اللہ

حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم کے معبودوں پر ایک ناقدانہ نظر ڈال کر فرمایا تھا:

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ۔ (۶: ۷۷)

میں غائب ہو جانے والی چیزوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہ ایک امرِ واقع ہے کہ آپ کی قوم کے لوگ صانعِ عالم کے منکر نہیں تھے، لیکن جس جس چیز کو وہ پسند کرتے اور بزعمِ خود اس کو اپنے حق میں نفع رساں خیال کرتے تھے، مثلاً سورج، چاند اور دیگر ستارے، انہی کو وہ پوجنے لگتے۔ خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کو بتایا کہ جو چیز نظروں سے غائب ہو جاتی ہے اور وہ اپنے عابدوں کا کلام سننے اور ان کا حال جاننے سے قاصر ہے، اور اُن کا نفع یا ضرر اس کے اختیار میں نہیں، وہ اس قابل نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے۔

الغرض، جس قدر بھی انسان توحید میں خلوص پیدا کرے، اسی نسبت سے اس کے دل سے غیر اللہ کو معبود ٹھہرانے کا خیال دُور ہوگا اور وہ گناہوں اور نافرمانیوں سے محفوظ رہے گا۔

مخلصین اور شیطانی تسلّط

اللہ تعالیٰ نے یوسف صدیق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عصمت کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ إِنَّهُۥ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ۔ (۱۲ : ۲۴)

اسی طرح ہم نے اس کے لئے عصمت کے سامان مہیا کئے، تاکہ برائی اور بے حیائی کو اُس سے دُور رکھیں۔ بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔

بُرائی اور بے حیائی کو اپنے مخلص بندوں سے دُور رکھنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں شیطان کو اِن الفاظ میں مخاطب فرمایا ہے:

إِنَّ عِبَادِى لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ۔ (۱۵ : ۴۲)

بیشک ہمارے خاص بندوں پر تجھے کسی قسم کا تسلّط نہیں ہوگا۔

اور اِس کے جواب میں شیطان نے کہا:

فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ، إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ۔ (۳۹ : ۸۳)

خدایا! تیری ذات کی قسم، میں اُن سب کے سب کو بہکا کر چھوڑوں گا، مگر جو تیرے مخلص بندے ہیں وہ بدراہی سے بچ جائیں گے۔

غرض شیطانی اکساوٹ اس قدر شدید ہونے کے باوجود بھی مخلص[1] بندے اُس کی زد سے بچ نکلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ان کے حق میں وعدہ ہے کہ شیطان کو اُن پر کچھ بھی اختیار و تسلّط نہیں۔

---

[1] اس لئے ہمیں خدا کے مخلص بندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی سعی کرنی چاہئے۔ اُن کے سے عقائد ہوں اور اُن جیسے اعمال بجا لائیں۔ (ناشر)

فصل ۵

اخلاصِ کلمۂ توحید

دخولِ جنت از قولِ لا الٰہ الا اللہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحیح حدیث مروی ہے کہ جو شخص خلوصِ قلب کے ساتھ کہہ دے "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ" اس پر دوزخ کی آگ حرام ہوگئی" کیونکہ اخلاص کی بدولت آدمی اُن اعمال کے ارتکاب سے محفوظ رہتا ہے جو انسان کو دوزخ کی آگ کا مستوجب بناتے ہیں۔ اور یہ یاد رہے کہ جو شخص باوجود لا الٰہ الا اللہ کہنے کے دوزخ میں ڈالا جائے گا اس کا سبب اخلاص کا نقدان یا کمی ہوگی اور اس کے دل میں شرک کا کوئی شائبہ موجود ہوگا۔ کیونکہ بعض اوقات شرک کا وجود چیونٹی کی چال سے بھی پوشیدہ تر ہوتا ہے، اس لئے انسان اپنے آپ کو اُس سے مبرّا خیال کرتا ہے۔

تجدیدِ اخلاص کا پروگرام

اسی بنا پر انسان کو مامور کیا گیا ہے کہ وہ ہر ایک نماز کی ہر ایک رکعت میں "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْن" کہہ کر اپنی توحید اور اپنے اخلاص کی تجدید کر لیا کرے۔ شیطان کی کوشش ہر وقت یہ رہتی ہے کہ وہ آدمی کو شرک میں مبتلا کر دے، اور آدمی کا نفس ہمیشہ اس کی تلقین اور القا کا اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے اور غیر اللہ کو بیم و اُمید کا قبلہ بنائے رکھتا ہے۔ لہٰذا انسان کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی توحید کو خالص رکھنے کی کوشش کرے اور اُسے شرک کی آمیزش سے پاک رکھے۔

ہلاکت آفرینیِ شیطان

ابن ابی عاصمؒ وغیرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث روایت کی ہے کہ شیطان کہتا ہے:

اھلکت النّاس بالذ نوب و اھلکونی بلا الٰہ الّا اللّٰہ والاستغفا
فلمّا رأیت ذٰلک ثبتُّ فیھم الاھواء فھم یذنبون ولا یستغفرون
لانھم یحسبون انھم یحسنون صنعا

میں نے لوگوں سے گناہ کرائے اور ان کو ہلاک کیا، لیکن انہوں نے لاالٰہ الّا اللّٰہ کہہ کر اور اللّٰہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرکے مجھ کو ہلاک کیا۔ لیکن جب میں نے دیکھا تو ان کو خواہشِ نفس کی پیروی میں لگا دیا[1] نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ نافرمانی کرتے ہیں اور مغفرت نہیں طلب کرتے، کیونکہ وہ اپنے اعتقاد میں ایک نیک کام کرتے ہیں۔

خواہشِ نفس کی پیروی

خواہشِ نفس کی پیروی یہ ہے کہ آدمی اللّٰہ تعالےٰ کی نازل کی ہوئی ہدایت کو چھوڑ دے اور جو طبیعت میں آئے، اس کو مانے اور عمل میں لائے۔ ایسے ہی شخص کے حق میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہے کہ:

مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ (۲۵: ۴۳) اس نے ہوائے نفس کو اپنا معبود قرار دیا ہے۔

اور چونکہ اس نے ہوائے نفس کو معبود ٹھہرالیا ہے، اس لئے وہ مشرک ہے اور اس کا شرک اس کے لئے مغفرت طلب کرنے سے مانع ہے۔

فصل ۶

توحید اور استغفار کی مناسبت

حفاظت از شرورِ آخرہ

برخلاف اس کے جس شخص نے اپنی توحید کو خالص رکھا اور خدائے تعالیٰ سے اپنے گناہوں کے لئے مغفرت طلب کی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ دنیا اور آخرت کے شرور سے محفوظ نہ رہے۔ اسی لئے ذوالنون

---

[1] عقاید اور اعمال میں اُن کو بدعتوں کے ایجاد پر مائل کردیا۔ (مترجم)

(حضرت یونس) علیہ السلام کی دعا یہ تھی:

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (۲۱ : ۸۷)

خدایا! تیرے سوا کوئی بھی میرا حاجت روا نہیں، بیشک میں خود ہی ظالموں میں سے ہوں۔

اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک کی اکثر آیتوں میں توحید اور استغفار کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہے:

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۔ (۴۷ : ۱۹)

تم جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی معبود نہیں، اور اپنے گناہ کے لئے اور مومن مرد اور مومن عورتوں کے لئے مغفرت طلب کرو۔

اور فرمایا:

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۙ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ

(۱۱ : ۲، ۳)

سوائے اللہ کے کسی اور کی عبادت مت کرو، بیشک میں اللہ کی طرف سے تمہارے لئے ڈرانے والا اور خوشخبری لانے والا ہوں اور بیشک تم اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کرو اور اسی کی طرف رجوع کرو۔

اسی سورہ میں قومِ عاد کے قصہ میں بعینہٖ یہی الفاظ مذکور ہیں۔

اور فرمایا:

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ (۱۱ : ۵۰)

اور قوم عاد کی طرف اُن کے بھائی ہود کو پیغمبر بنا کر بھیجا جس نے انہیں کہا اے قوم! اللہ کی عبادت کرو کیونکہ اس کے بغیر تمہارا کوئی معبود نہیں۔

اور فرمایا:

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۔ (۱۱ : ۵۲)

یہ کہ اپنے رب سے مغفرت طلب کرو اور توبہ کرکے اُسی کی طرف رجوع کرو۔

رہ میں قوم عاد کے قصہ میں بعینہٖ یہی الفاظ مذکور ہیں۔ سورۂ فصلت سے پہلے

سورۂ "فصّلت" کے پہلے رکوع میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۔ (۴۱ : ۶)

(اے رسول اللہ) کہہ دو کہ بیشک میں تم جیسا انسان ہوں (فرق یہ ہے کہ) میری طرف وحی کی گئی ہے۔ بیشک تمہارا معبود ایک ہے اور تم سیدھے ہو کر اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اس سے مغفرت طلب کرو۔

مجلس کے خاتمہ کی دعا

حدیث شریف میں آیا ہے کہ مجلس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہونا چاہئے:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ ۔

اے خدا! تو پاک ہے اور تیرے لئے سب تعریفیں ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تجھی سے مغفرت طلب کرتا اور تیری طرف ہی رجوع کرتا ہوں۔

اگر وہ مجلس اچھی تھی تو یہ کلمات بمنزلہ مُہر ہو جائیں گے، لیکن اگر وہ بیہودہ مجلس تھی تو یہ کلمات اس کا کفارہ ہو جائیں گے۔

ادعیۂ آخرِ وضو اور نماز

نیز ایک حدیث شریف میں ہے کہ وضو کے آخر میں یہ کہنا چاہئے:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۔

گواہی دیتا ہوں میں کہ اللہ واحد اور لاشریک کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں میں اس بات کی کہ حضرت محمدؐ اللہ کے بندے اور اُسکے رسول ہیں خدایا! مجھ کو توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ بندوں میں سے بنا دے۔

یہ دونوں اذکار توحید اور استغفار پر مشتمل ہیں۔

ایک دوسری روایت میں وضو کے آخر میں بعینہٖ اُنہی کلمات کا کہنا منقول ہے جو

مجلس کے خاتمہ پر کہے جاتے ہیں جو دینِ اسلام کی اصل و اساس ہیں کیونکہ دین تمام تر انہی دو شہادتوں میں داخل ہے۔ اس لئے ان ہردو کا مضمون یہ ہے کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی بھی عبادت نہیں کرتے اور اس کے رسولؐ کی پیروی کرتے ہیں۔ بس یہی دینِ اسلام کا خلاصہ ہے۔ اللہ کی عبادت بھی اللہ کی اطاعت اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے ذریعے ہوتی ہے اور ہر ایک فرضی اور نفلی عبادت بھی اسی اطاعتِ الٰہی اور اطاعت رسولؐ میں مضمر ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ کفارۂ مجلس کی دُعا نماز کے آخر اور وضو کے آخر میں بھی پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز کے آخر میں یہ دُعا پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ۔

یا اللہ! مجھے بخش دے اور میرے وہ سب گناہ بخش دے جو میں پہلے کر چکا ہوں یا بعد میں کروں گا، اور جو پوشیدہ کئے ہیں اور جو علانیہ کئے ہیں، اور جو کچھ کہ تو میرے متعلق جانتا ہے۔ تو مقدم اور تو ہی مؤخر۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

اس میں بھی وہی استغفار اور توحید ہے۔ نماز کی دُعا میں کلمۂ توحید کو اس لئے آخرِ دُعا میں رکھا گیا ہے کہ نماز کا خاتمہ بہترین کلمہ پر ہو۔

افضل اور مفضول

البتہ جہاں پر یہ بات مقصود بالذات نہیں، وہاں توحید کو مقدم رکھا گیا ہے (مثلاً خاتمۂ مجلس اور خاتمۂ وضو کی دعاؤں میں) کیونکہ بلحاظ نوعیت کے وہ دعا جس کا مفہوم اللہ تعالیٰ کی ثناء اور تعریف ہو، اس دُعا سے بہتر اور افضل ہے جو سوال اور طلب پر مشتمل ہے۔ اگرچہ بعض موقعوں پہ مفضول کو کسی خاص سبب کی بناء پر افضل سے ترجیح دی جاتی ہے۔ چنانچہ نماز،

مطلق قرأۃ سے افضل ہے اور قرأۃِ قرآن کو اُن اذکار پر ترجیح ہے جو حمد و ثنا پر مشتمل ہیں، اور اس قسم کے اذکار اُن دعاؤں پر فوقیت رکھتے ہیں، جن میں خالص سوال اور طلب ہے۔ لیکن بایں ہمہ بعض اوقات اور بعض جگہوں میں مفضول کو کسی خاص وجہ کی بنا پر افضل سے راجح مانا جاتا ہے۔

تمام ادیان کا نچوڑ

بہرحال اس بات کو بخوبی یاد رکھنا چاہیئے کہ دین کا آغاز اور انجام اور اس کا ظاہر اور باطن، توحید اور خالص توحید ہے۔ اور دینِ اسلام تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ادیان کا زُبدہ اور ملخّص ہے اور لوگوں کے دلوں پر لا الٰہ الّا اللہ کا گہرا نقش بٹھانا ہے۔

فصل

توحیدِ ربوبیّت اور توحیدِ اُلوہیّت

عام مسلمانوں کا اقرار

عام مسلمان لا الٰہ الا اللہ کے مضمون کا سرسری اقرار کرتے ہیں، لیکن توحید کو خالص بنانے میں اُن کے درجات میں ایک وسیع اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جس توحید کو فرضِ مؤکد قرار دیا گیا ہے، اُس کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ کوئی شخص یہ اقرار کرلے کہ ہر ایک چیز کا پیدا کرنے والا ایک خدا ہے اور وہی ان کی پرورش کا کفیل ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ توحیدِ ربوبیّت اور چیز ہے اور توحیدِ اُلوہیّت اَور چیز ہے۔

عقیدۂ مشرکینِ عرب

توحیدِ ربوبیت کا تو عرب کے مشرکوں کو بھی اقرار تھا۔ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ آفرینندۂ عالم ایک نہیں، یا سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اَور بھی ایسا خدا موجود ہے جو پروردگارِ مطلق کہلا سکے۔ اللہ تعالیٰ

نے اپنے کلام پاک میں واضح طور پر اُن کا یہ عقیدہ بیان فرمایا ہے (یعنی یہ کہ وہ خالق عالم کو ایک سمجھتے تھے) فرمایا:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ۔ (۴۳: ۹)

اگر تم ان سے دریافت کرو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ یہی کہیں گے کہ ان چیزوں کو خدائے غالب اور باخبر نے پیدا کیا۔

اور فرمایا:

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ (۱۲: ۱۰۶)

اُن میں سے اکثر اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لائے بلکہ وہ مشرک ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ؟ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ، قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ؟ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ؟ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ، أَفَلَا تَتَّقُونَ؟ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ؟ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ، قُلْ فَأَنّٰى تُسْحَرُونَ۔

(۲۳: ۸۵ تا ۸۹)

(اے نبیؐ) ان سے پوچھیے: زمین اور جو کچھ اس میں ہے کس کی ملکیت ہے؟ اگر تم جانتے ہو۔ ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں کا پروردگار اور بڑے عرش کا مالک کون ہے؟ اس کے جواب میں وہ ضرور یہ کہیں گے کہ اللہ ہی تو ہے۔ آپ پوچھیں تو پھر کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے! پھر پوچھیں کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر ایک چیز کا کامل تصرف ہے اور کون دوسروں کو پناہ دیتا ہے اور خود پناہ نہیں چاہتا؟ اس کے جواب میں وہ ضرور یہ کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے آپ پوچھیں کہ پھر تم کیوں سحر ہوئے پھرتے ہو؟

انکارِ توحیدِ الوہیت

لیکن یہ مشرک باوجود اس اقرار کے کہ خالق ارض وسما اللہ ہی ہے اور وہی سب کا پروردگار ہے، خدا کی توحیدِ الوہیت

کے معترف نہیں تھے جس کی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے تعلیم دی ہے بلکہ دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنا رکھا تھا، جن کو وہ بارگاہِ کبریا میں اپنا شفیع خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا یہ قول قرآنِ کریم میں منقول ہے:

وَيَقُولُونَ هٰؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ۔ (۱۰ : ۱۸)	تو وہ کہتے ہیں: ہمارے یہ معبود اللہ کے سامنے سفارشی ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهٖٓ أَوْلِيَآءَ، مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ (۳۹ : ۳)	جن لوگوں نے غیر اللہ کو اپنا کارساز مقرر کر رکھا ہے، وہ کہتے یہ ہیں کہ ہم ان کی عبادت (معبود سمجھ کر) نہیں کرتے بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ خدا کی بارگاہ میں ہمارے لئے حصولِ قرب کا موجب ہوں۔

شرک محبتِ غیر اللہ کا نام ہے

اُن لوگوں کا شرک یہ تھا کہ وہ محبت، عبادت اور طلبِ حاجات میں دوسروں کو اللہ تعالیٰ کا شریک گردانتے تھے، اگرچہ اعتقاد اور اقرار کے لحاظ سے وہ موحد تھے۔ کلامِ پاک میں ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (الیٰ آخر الآیۃ) (۲ : ۱۶۵)	لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو غیر اللہ کو اس کا شریک گردانتے اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرنی چاہیے۔ (صفحہ ۴۶، ۴۷ پر پوری آیت درج کی جا چکی ہے)

اس آیت کریمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص کسی مخلوق کے ساتھ ویسی محبت رکھتا ہے جو اس کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ رکھنی چاہیئے، تو وہ مشرک ہے اور اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے۔ چاہے وہ اس بات کا اقرار کرے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس کو پیدا کیا اور وہی اس کو رزق دیتا ہے۔

اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْحُبُّ مَعَ اللّٰہ کا فرق

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے اُن دو شخصوں میں فرق بتایا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے کسی سے محبت رکھتا ہے، اور وہ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی اپنا محبوب قرار دے رکھا ہے۔ پہلے شخص کی محبت اور عبادت کا منتہیٰ اور مقصود فقط اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا بالاستقلال اس کا محبوب نہیں ہوتا۔ لیکن ساتھ ہی وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بعض بندوں سے یعنی انبیاء اور صالحین سے محبت ہے، اس لئے وہ بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس کو ان کا بذاتِ خود محبوب بنانا مقصود ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ خدا کے محبوب ہیں۔

ترکِ محظورات اور بجاآوریٔ مامورات

اسی طرح وہ جانتا ہے کہ مامورات کا بجالانا اور محظورات کا ترک کرنا خدا تعالیٰ کو پسند ہے، اس لئے وہ ایسا ہی کرتا ہے، کیونکہ اس کی محبت خدا کی محبت کے تابع رہتی ہے۔ برخلاف اس کے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں بلکہ (اپنی خواہش نفس کے مطابق) اس کے ساتھ کسی دوسرے کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، اور اپنی امید و بیم کو اس سے وابستہ کرتا ہے اور ہر حالت میں اس کی اطاعت کرتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کی اطاعت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور اس کو اپنا شفیع سمجھتا ہے، اگرچہ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو شفیع مقرر فرمایا ہے۔ فرمایا:

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۔ (۱۰ : ۱۸)	اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو کچھ نفع یا ضرر نہیں پہنچا سکتے، اور کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہمارے شفیع ہیں۔ اُن سے پوچھو، کیا تم اللہ کو وہ بات بتانا چاہتے ہو، جو زمین و آسمان میں نہیں جانتا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں تو کوئی بھی اس قسم کا شفیع نہ آسمانوں میں ہے اور نہ زمین میں ہے، لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے شفیع ہیں۔ تو کیا وہ خدائے تعالیٰ کو ایک ایسی بات بتانا چاہتے ہیں جو وہ نہیں جانتا۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔
(۹ : ۳۱)

ان لوگوں (یہودیوں اور عیسائیوں) نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ اور عیسیٰ بن مریم کو خدا بنا رکھا ہے۔ حالانکہ ان کو تو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک ہی خدا کی عبادت کریں۔ اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی معبود نہیں، اور وہ ان باتوں سے پاک و برتر ہے جن کے ذریعے وہ شرک کرتے ہیں۔

اس آیت سے نہایت صاف اور واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء اور علماء و مشائخ کی تعظیم اور اطاعت میں اگر غلو کیا جائے تو یہ بھی شرک ہے، چاہے وہ غلو کرنے والا اس کو شرک نہ سمجھتا ہو۔

روایتِ عدیؓ بن حاتم

اس کی مزید توضیح عدیؓ بن حاتم رضؓ کی حدیث سے ہوتی ہے اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں اس آیت کے متعلق استفسار کیا تھا کہ ہم عیسائی لوگ تو اپنے علماء و مشائخ کو اپنا معبود نہیں سمجھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: وہ اُن کے لئے حلال کو حرام کر دیتے تھے اور حرام کو حلال قرار دیتے تھے جس کی وہ بے تامّل اطاعت کرتے تھے۔ یہی ان کی عبادت تھی[1]۔ قرآن کریم میں ہے:

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ

کیا انھوں نے اپنے لئے خدا کے شریک مقرر کر رکھے ہیں جنہوں نے اُن کے لئے ایک ایسا مذہب ایجاد کیا

[1] یعنی اندھا دھند کسی کی تقلید کرنا بھی شرک ہے اور اسی کو غیر اللہ کی عبادت کہتے ہیں۔

بِہٖ اللّٰہُ ۔ (۴۲ : ۲۱) | جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی ۔

تعظیم مشائخ میں غلو

واضح رہے کہ جو شخص کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی عالم، مجتہد یا شیخ طریقت کے قول کا اس لئے اتباع کرتا ہے کہ وہ "اُس کا قول"[1] ہے، یقیناً وہ اس آیت کریمہ کے مفہوم میں داخل ہوگا ۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ، يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ، لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ط وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ۔

(۲۵ : ۲۷ تا ۲۹)

اور اس حالت کو یاد رکھو جبکہ ظالم آدمی (جس نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو پسِ پُشت پھینکا تھا) انتہا درجہ کا افسوس کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ کاٹیگا اور یہ کہیگا، کاش! میں نے پیغمبرِ خُدا کے ساتھ رہنا اور اس کے راستہ پر چلنا اختیار کیا ہوتا ۔ ہائے افسوس کاش! میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست بنایا ہوتا بیشک اس نے مجھے بہکا کر اللہ کے کلام سے دُور پھینک دیا ۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا کلام میرے پاس آچکا تھا ۔ اور بے شک شیطان انسان کو تکلیف کے وقت بالکل اکیلا چھوڑ دینے والا ہے ۔

---

[1] کسی پیر و مرشد کی اس طرح تقلید کرنا پیر پرستی میں داخل ہوگی ۔ اگر اُس کی بات شریعت کے مطابق ہے، تو اُس کی پابندی عین شریعت کی پابندی ہوگی ۔ لیکن اگر وہ متبع شریعت نہیں، تو خواہ وہ آسمان پر اُڑتا ہُوا آئے، بے شمار کرامات کا ظہور اُس کے ہاتھ پر ہو، اُسکی بیعت قطعاً حرام ہے ۔ اگر بیعت ہو جائے تو اُس کا توڑنا فرض عین ہے ۔ اگر نہ توڑیگا تو کافر زندیق اور اس میں کچھ فرق نہ ہوگا ۔ خسر الدنیا والآخرۃ نتیجہ ہوگا ۔ (ناشر)

باب ۴

اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسولؐ

فصل ۱

رسُول اور غیر رسُول

مقصدِ ارسالِ رُسُل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت تو اس لئے فرض ہے کہ آپؐ کی اطاعت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ فرمایا:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ (۴ : ۸۰)

جس شخص نے رسولؐ کی اطاعت کی تو بے شک اُس نے خُدا کی اطاعت کی۔

پس حلال وہی ہے جو رسولؐ نے حلال ٹھہرایا اور حرام وہی ہے جسے رسولؐ نے حرام قرار دیا، اور دین وہ ہے جسے رسولؐ نے شریعت قرار دیا۔ اور کیوں نہ ہو، رسولؐ کے بھیجنے کا تو مقصد یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچائے، اور اس کے احکام کی بے کم وکاست تبلیغ کرے لیکن رسولؐ کو چھوڑ کر دوسرے علماء اور مشائخ اور ملوک و اُمراء سب کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کا حکم اور اُن کی ہدایت وارشاد، اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت کے موافق ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ (۴ : ۵۹)

اے مومنو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور مومن حاکموں کی اطاعت کرو۔

مامور من اللہ اور اُولی الامر

الرَّسُوْلَ کے ساتھ اَطِیْعُوا کا لفظ دوبارہ ذکر کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ رسول کی اطاعت بھی خدا کی اطاعت کی طرح فرض ہے اور جب رسول اللہ صلی علیہ وسلم کوئی حکم بیان کریں تو کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اُس کے ماننے میں چون وچرا کرے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مامور ہو کر حکم دیتے ہیں:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى ۔ (۵۳ : ۴)	وہ تو اپنی خواہش نفسانی سے کچھ بھی نہیں کہتا اس کو تو وحی آتی ہے (تب وہ بولتا ہے)

برخلاف اس کے علماء اور مشائخ اور ملوک و اُمراء جن کو اس آیت میں "اولی الامر" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے کسی ایسی بات کا بھی حکم اُن سے صادر ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ اور اس کے احکام کے خلاف ہو۔ اس لئے "اولی الامر" کے لفظ کو "الرسول" پر عطف کیا گیا ہے۔ یعنی اُن کی اطاعت کے لئے یہ شرط ہے کہ اُن کا حکم "الرسول" کی تعلیم کے مطابق ہو۔ اس کی توضیح اسی آیت کے آخری حصہ سے ہوتی ہے کہ:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۔ (۴ : ۵۹)	اگر بالفرض کسی بات میں تمہارا اختلاف ہو جائے، تو اگر تم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو، تو (اس اختلاف کا فیصلہ کرانے کے لئے) اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔

دین کا ملخص

اس تقریر کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے سے یہ بات بخوبی تمہاری سمجھ میں آسکتی ہے کہ دین کا ملخص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کی جائے اور بس۔ ارشاد ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ (۱۲ : ۴۰)	سوائے اللہ کے کسی کو حکم دینے کا حق حاصل نہیں۔

اور فرمایا:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (۸ : ۳۹)

اور کافروں کے ساتھ لڑو، یہاں تک کہ شرک و کفر کا فتنہ ختم ہو جائے اور تمام تر اطاعت اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہو جائے (صرف اسی کا حکم مانا جائے)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ "یا رسول اللہ! آپ اُس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، جو اس لئے جہاد کرتا ہے کہ اُسے شجاع و بہادر کہا جائے یا قومیت کی خاطر لڑتا ہے یا ریاکاری کی بنا پر، تو کیا اُسے مجاہد فی سبیل اللہ کا نام دیا جائیگا؟ آپ نے فرمایا:

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔

مجاہد فی سبیل اللہ وہ ہے جس نے اس غرض سے جہاد کیا کہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔

غُلو فی التوحید بہت سے لوگ کسی خلیفہ یا عالم یا شیخ یا امیر کو اس حد تک محبوب سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کو خدا کا شریک بنا دیتے ہیں۔ اور گو وہ بظاہر یہی کہتے ہیں کہ ہماری محبت اُن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، لیکن جو شخص سوائے رسولؐ کے کسی اور کو یہاں تک بڑھا دیتا ہے کہ اُس کے ہر ایک امر اور نہی کو بغیر چون و چرا کے تسلیم کر لیتا ہے، چاہے اُس میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولؐ کی مخالفت ہوتی ہو، تو سمجھ لو کہ اُس نے اس کو خدائے تعالیٰ کا شریک بنا لیا۔

پیری مُریدی کا جوشِ جنوں اور کچھ بعید نہیں کہ عقیدت کا جوش اُس کو اپنے محبوب کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے پر آمادہ کرے جو نصاریٰ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا اپنے احبار اور رُہبان کے ساتھ کرتے ہیں یعنی قضائے حاجات کے لئے اُس کو پکارنے لگے، اُس سے فریاد خواہی کرے۔ اُس کے دوستوں سے محبت رکھے اور اس کے دشمنوں کو مبغوض سمجھے اور ہر ایک بات[1] میں اُس کی اطاعت

---

[1] قطع نظر اس سے کہ وہ بات اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیم کے موافق ہو یا مخالف۔

کو لازم سمجھے۔[۱]

بیشک یہ ارشادِ باری تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کے حق میں نازل ہوا ہے کہ :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۔ (۲ : ۱۶۵)	لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو غیر اللہ کو اُس کا شریک گردانتے ہیں اور اُن سے ایسی محبت کرتے ہیں کہ جیسی اللہ کے ساتھ کرنی چاہیئے ۔

فصل ۲

ایمان اور اسلام کا مفہوم

عقائد و اعمالِ قلب

الغرض قلب کے اعمال بھی توحید اور شرک کی ویسی ہی حکومت ہے جیسی کہ قلب کے عقاید میں۔ چنانچہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ التوحید قول القلب والتوکل عمل القلب "(توحید، قلب کا قول ہے اور توکل، اُس کا عمل ہے) اس توحید قولی سے آپ کی مراد قلب کی تصدیق ہے، کیونکہ اس کو توکل کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ ویسے اگر توحید کا لفظ استعمال کیا جائے تو وہ قلب کے قول (یعنی اس کی تصدیق) اور اس کے عمل دونوں کو شامل ہوتا اور توکل بھی توحید کا تتمہ ہے۔

اس کی مثال بعینہ ایمان کے لفظ کی ہے کہ اگر اس کو علیحدہ استعمال کیا جائے تو تمام ظاہر اور باطن کے اعمال اس کے مفہوم میں داخل ہوتے ہیں۔ عام طور پر سلف

---

[۱] جیسے کہ اکثر مرید اپنے پیروں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں اور اپنے عقیدہ کی ترجمانی کے لئے یہ شعر زبان پر لاتے ہیں ؎ بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید

مترجم

کا یہ قول مشہور ہے کہ "الایمان قول و عمل"۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ایمان، قلب اور زبان کے قول اور قلب اور جوارح کے اعمال کا نام ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

الایمان بضع وستون شعبة اعلاها قول: لا اله الا الله وادناها اماطة الاذیٰ عن الطریق والحیاء شعبة من الایمان۔

ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں۔ سب سے اعلیٰ شاخ لا الٰہ الا اللہ کہنا اور ادنیٰ ترین شاخ یہ ہے کہ راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دیا جائے اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (۴۹ : ۱۵)

یقیناً مومن وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور پھر انہوں نے کبھی اس میں شک نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ایماندار ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ، اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ (۸ : ۲ تا ۴)

یقیناً مومن وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل ڈرنے لگتے ہیں اور جب اُن پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں تو اُن کی تلاوت اُن کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ صرف اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کو قائم رکھتے اور جو چیز ہم نے اُن کو بخشی ہے اُس سے کچھ خرچ بھی کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں۔

تیسری جگہ فرمایا:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۔ (۲۴ : ۶۲)

سچے مسلمان تو وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان رکھیں اور جب کبھی رسول کے ہمراہ کسی جمعیت کے کام میں جاتے ہیں تو اُس کی اجازت کے بغیر اِدھر اُدھر کہیں نہیں جاتے ۔

ہر مسلم مومن نہیں

ایمان کا لفظ مطلق ذکر کیا جائے تو وہ اسلام کے مفہوم کو بھی شامل ہوتا ہے ۔ جیسے کہ صحیحین کی ایک حدیث ہے کہ جب قبیلۂ عبد القیس کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ:

امرکم بالایمان باللہ، اتدرون ما الایمان باللہ؟ شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وان تؤدوا خمس ما غنمتم ۔

میں تم کو ایک خدا پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہوں ۔ کیا تم جانتے ہو کہ ایک خدا پر ایمان لانے کے کیا معنے ہیں؟ اس کے یہ معنی ہیں کہ تم اس بات کی شہادت دو کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے رسول ہیں ۔ نماز قائم رکھو، زکوٰۃ دیا کرو اور جو کچھ مالِ غنیمت تمہارے ہاتھ آئے اُس کا پانچواں حصہ (بیت المال میں) ادا کیا کرو ۔

اِسی بنا پر سلف فرماتے ہیں کہ:

کل مومن مسلم ولیس کل مسلم مؤمنا

ہر ایک مومن مُسلم ہے لیکن ہر ایک مُسلم مومن نہیں ہے ۔

حقیقتِ ایمان، اسلام، احسان

الغرض مُطلق ایمان کا لفظ استعمال ہو تو اعمال اُس کے مفہوم میں داخل ہوتے ہیں جیسے کہ تفصیل بالا سے ظاہر ہے، لیکن اگر اس کے مقابلے میں اسلام یا عمل کا ذکر کیا جائے تو وہاں یہ

ایمان کا مفہوم یقینِ قلبی تک محدود رہتا ہے جیسے کہ کلامِ پاک میں کثرت سے "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" مذکور ہے ۔

صحیحین کی ایک حدیث ہے کہ جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک آدمی کی شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان، اسلام اور احسان کی حقیقت دریافت کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا :

الایمان ان تؤمن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والبعث بعد الموت وتؤمن بالقدر خیرہ وشرہ ۔

ایمان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں پر یقین کرو۔ مرنے کے بعد زندہ ہونے کی تصدیق کرو اور خیر و شر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہونے کو تم باور کرو ۔

الاسلام ان تشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ وتقیم الصلوٰۃ وتؤتی الزکوٰۃ وتصوم رمضان وتحج البیت ۔

اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی شہادت دو کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور محمد صلعم اس کے رسول ہیں اور نماز کو قائم رکھو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ شریف کا حج بجالاؤ ۔

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ، فان لم تکن تراہ فانہ یراک ۔

احسان کے معنی یہ ہیں کہ تم خدائے تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو، اور اگر بالفرض تم اُس کو دیکھ نہیں سکتے تو اس میں شک نہیں کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے ۔

اس حدیث میں ایمان اور اسلام کے مفہوم کو الگ الگ بیان فرمایا ہے؛ لیکن اس سے پہلے جو حدیث مذکور ہے، اُس میں چونکہ صرف ایمان کا ذکر ہے (یعنی اس کے مقابلے میں اسلام وغیرہ مذکور نہیں) اسلام کے مفہوم کو بھی اِس کے مفہوم میں داخل بتایا ہے ۔

منقاد و مطیع کی تشریح

ظاہری اعمال، ایمان بالقلب کا نتیجہ اور اُس کا مقتضیٰ ہے، جس کا بالفاظِ دیگر یہ مطلب ہے کہ اگر دل میں ایمان ہو گا تو یہ ضروری ہے کہ جوارح سے بھی اُس کے مناسب اعمال سرزد ہوں۔ ایمان بالقلب کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ نہ صرف اس کا دل جس چیز پر وہ ایمان لایا ہے، اس کی بھی تصدیق کرے، بلکہ اس کے لئے منقاد اور مطیع ہو جائے۔ اس لئے کہ اگر کوئی شخص دل سے اس بات کی تصدیق کرے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں، لیکن اس کے دل میں آپ کی نسبت بُغض اور حسد بھرا ہوا ہے، اور وہ آپ کی متابعت سے سرتابی کرتا ہے، تو سمجھ لیں کہ اس کا دل مومن نہیں ہے۔

حواس ادراک سے بالاتر اُمور

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچہ ایمان کے مفہوم میں تصدیق کے معنی پائے جاتے ہیں، لیکن ہر ایک تصدیق کو ایمان سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ دو کا نصف ایک ہے، یا آسمان ہمارے سروں پر ہے اور زمین ہمارے قدموں کے نیچے ہے۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُس کو ان باتوں پر ایمان ہے۔ بلکہ ایمان کا اطلاق اُن امور کی تصدیق پر ہوتا ہے جو حواس کے ادراک سے بالاتر ہوں اور اُن کا جاننا بدیہی نہ ہو۔ جیسے حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے باپ سے کہا:

آپ ہماری بات کو ماننے والے نہیں۔	وَمَآ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا۔ (۱۲: ۱۷)

کیونکہ انہوں نے ایک ایسی خبر کی اطلاع دی تھی جو اُس سے پوشیدہ تھی، اور وہ اس کے باور کرنے میں اختلاف کرتے تھے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

پس موسےٰ پر سوائے اُس کی قوم کے چند آدمیوں کے کوئی بھی ایمان نہ لایا۔	فَمَآ اٰمَنَ لِمُوۡسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنۡ قَوۡمِهٖ۔ (۱۰: ۸۳)

نیز فرمایا:

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ - (۹ : ۶۱)

اور بعض اُن میں سے وہ لوگ ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کان کے کچے ہیں۔ کہہ دو (اے نبیؐ) وہ تمہارے فائدے کے کان ہیں، اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنوں پر یقین۔

یہاں ایمان باللہ اور ایمان بالمومنین میں فرق کیا گیا ہے، جس سے مراد مومنوں کی تصدیق کرنا ہے۔

بہرحال ایمان باللہ سے مقصود اقرار لسانی ہے جیسے فرعون اور اُس کے سرداروں کا قول ہے جو حضرت موسیٰ اور ہارون کے متعلق انہوں نے کہا۔ قرآن میں ہے:

اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا (۲۳ : ۴۷)

کیا ہم ان پر ایمان لائیں جو ہماری طرح دو آدمی ہیں؟

جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُن کا اقرار اور تصدیق نہیں کرتے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ - (۲ : ۷۵)

کیا تم اس بات کی اُمید رکھتے ہو کہ وہ تم پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ اُن میں سے ایک گروہ اللہ کے کلام کو سنتا ہے اور سمجھ لینے کے بعد اُس کی تحریف کر دیتا ہے۔

دوسرے معنی کے متعلق فرمایا:

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ - (۲ : ۳)

وہ غیب کی حقیقتوں پر ایمان لے آتے ہیں۔

اور فرمایا:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟

جو کچھ اللہ کی طرف سے اُتارا گیا ہے اُس پر رسول اور مومن ایمان لاتے ہیں اور اللہ پر ایمان لانے کے بعد اُس کے فرشتوں، اُس کی کتابوں اور اُس کے

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ، (۲: ۲۸۵)	رسولوں پر، اور کہتے ہیں کہ ہم اُس کے رسولوں میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کرتے۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ۔ (۲: ۱۷۷)	لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص اللہ پر، آخرت کے دن پر، اُس کے فرشتوں پر، اس کی کتاب پر اور اس کے نبیوں پر ایمان لانا یعنی سب کا اقرار کرنا۔

اور اس طرح قرآن شریف میں کثرت سے آیات آئی ہیں۔

مومن اور کافر کی شناخت

الغرض ایمان بعض اُمورِ غیبیہ کے ماننے کا نام ہے، اور یہ بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے کہ قلب میں اس تصدیق پر عمل بھی پایا جائے۔ کیونکہ اگر ایک آدمی جانتا ہے اور اس کو یقین ہے: کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خُدا کے سچے رسول ہیں، لیکن اس کے دل میں اُن کی محبت اور تعظیم نہیں، بلکہ اس کے بجائے بُغض اور حسد سے اُس کا دِل لبریز ہے، اور وہ آپؐ کے اتباع کو اپنے لئے کسرِشان سمجھتا ہے، ایسے شخص کو مومن نہیں بلکہ کافر کہیں گے۔ ابلیس، فرعون اور بعض اہلِ کتاب کا کُفر اسی قسم کا ہے۔

انکارِ شیطانی کی نوعیت

ابلیس اچھی طرح جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اُس پر شرف بخشا ہے اور اُسی کے حکم سے وہ ملائکہ کا مسجود قرار پایا ہے، لیکن اُس کا تکبر اُس کو اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اُس حکمِ الٰہی عزوجل کی تعمیل میں اپنا سر خم کرے۔ اسی تکبر و غرور کی بدولت وہ راندۂ درگاہِ الٰہی قرار پایا۔

فرعون کا انکار

اسی طرح فرعون بھی جانتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک سچا رسول ہے، قرآن میں ہے:

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ	باوجودیکہ فرعون اور اُس کی قوم اپنے دلوں میں یقین

اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا۔

(۲۷ : ۱۴)

کرتے تھے کہ حضرت موسیٰؑ کی لائی ہوئی نشانیاں سچی ہیں لیکن پھر بھی انہوں نے ازراہِ تکبر و عناد اُن کا انکار کیا۔

دوسری جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول منقول ہے۔ جس سے آپ نے فرعون کو مخاطب فرمایا ہے۔ قرآن کا بیان ہے:

لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا۔ (۱۷ : ۱۰۲)

اے فرعون! بیشک تم جانتے ہو کہ یہ نشانیاں جو چراغِ بصیرت ہیں، اُسی خدا نے نازل فرمائی ہیں جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، اور بیشک میں خیال کرتا ہوں کہ تم ہلاک ہو کر رہو گے۔

اہلِ کتاب کے حق میں وارد ہوا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ

(۲ : ۱۴۶)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ رسُول کو اِس طرح پہچانتے ہیں جس طرح کوئی اپنے بیٹے کو پہچانتا ہے (اور اس کی شناخت میں کبھی غلطی نہیں کرتا)۔

علم اور عمل کی ناموافقت

بنا بر دلائل مذکورہ بالا اگر دل میں علم تو ہو، لیکن عملِ قلب اس کے موافق نہ ہو تو یہ علم و دانش کچھ بھی مفید نہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن سخت ترین عذاب اُس شخص کے لئے ہے۔ جس نے اپنے علم سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دُعاء میں اکثر فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ وَنَفْسٍ لَّا تَشْبَعُ وَدُعَآءٍ لَّا يُسْمَعُ وَقَلْبٍ لَّا يَخْشَعُ

خدایا! میں تیری پناہ میں آتا ہوں، ایسے علم سے جو نفع رساں نہ ہو، اور ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو، اور ایسی دعاء سے جو قبول نہ ہو، اور ایسے قلب سے جو عاجزی نہ کرے۔

فرقۂ جہمیہ کا اعتقاد

باایں ہمہ فرقۂ جہمیہ کا خیال ہے کہ "صرف تصدیقِ قلبی کا نام ایمان ہے اور جہاں کہیں شریعت نے کسی کے حق میں یہ کہا کہ وہ مومن نہیں تو سمجھ لو کہ اس کے قلب میں تصدیق نہیں تھی"۔ لیکن ایسا خیال کرنا ایک بہت بڑی جہالت ہے۔ اور اُن کے اس قول سے یہ لازم آتا ہے کہ مومن اور کافر میں کچھ فرق نہیں۔ وکیع بن الجراح اور امام احمد بن حنبل وغیرہ ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو جن کا یہ اعتقاد ہو، کافر کہا ہے۔

فصل ۳

تصدیقِ قلبی اور عملِ قلب

الایمان قولٌ وعملٌ

یہ ایک مانی ہوئی اور معلوم بات ہے کہ انسان بعض اوقات حق اور باطل کو پہچانتا ہے، تاہم کسی خاص غرض کے لئے حق کو تسلیم کرنا اُس پر شاق ہوتا ہے اور وہ اس کو مبغوض سمجھتا ہے، اور یہ ضروری نہیں کہ جو شخص ازراہِ تکبر حق کا انکار کرتا ہے، وہ دل میں بھی اس کی حقانیت کا قائل نہ ہو۔ لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ ایمان کی حقیقت فقط تصدیقِ قلبی کا نام نہیں، بلکہ عملِ قلب بھی اس میں شامل ہے، جس کی پہلے تشریح کی گئی ہے، اسی لئے سلف صالحین فرمایا کرتے تھے کہ "الایمان قولٌ وعملٌ"۔

ایمان کا مقتضیٰ

اب تم یہ سمجھ لو کہ جب دل میں تصدیق کامل کے ساتھ (اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کی) محبت بھی بدرجۂ اتم موجود ہو (جو بہرحال ایمان کا مقتضیٰ ہے) تو یقیناً اس محبت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس کے دل میں اعمالِ صالحہ کے لئے جازم ارادہ پیدا ہوگا۔ اس حالت میں اعمالِ صالحہ کا ظہور میں آنا قطعی ہے۔ کیونکہ جازم

ارادہ کے ساتھ اگر قدرت علی العمل بھی موجود ہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ عمل جس کا ارادہ کیا گیا ہے، ظہور میں نہ آئے ۔ کیونکہ یقین کامل کے ساتھ اعمالِ صالحہ لازمی ہیں ۔

اِرادہ اور قدرت کی کمزوری

کسی عمل کے وجود میں آنے سے صرف دو باتیں مانع ہوسکتی ہیں : ناقص اور کمزور ارادہ، اور ناقص قدرت۔ لیکن اگر ان دونوں صفات میں کوئی نقصان نہیں تو افعالِ اختیاریہ کا وجود میں آنا قطعی اور لازمی ہے ۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ جب دل اس بات کا قائل ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور آپؐ کی محبت بھی علی الکمال قلب میں موجود ہے، تو ممکن نہیں کہ وہ شخص باوجود قدرت کے زبان سے اقرار نہ کرے ۔ یہ اور بات ہے کہ گونگا ہونے کی وجہ سے یا کسی دوسرے عُذر کی بنا پر وہ زبان کے ساتھ شہادت کا اظہار کرنے سے قاصر ہو ۔ ورنہ دلی جذبات کا اقرار لسانی ضروری ہے ۔

نقصِ یقینِ ابوطالب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کو اگرچہ اس بات کا یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خُدا کے سچے رسول ہیں، ساتھ ہی اُس کو آپؐ سے محبت بھی تھی ۔ لیکن اس کی یہ محبت اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں تھی بلکہ اس کی محبت خُون کے تعلق پر مبنی تھی ۔ کیونکہ آپؐ اُس کے بھتیجے تھے ۔ اور وہ آپؐ کا غلبہ اور تفوّق اس لئے نہیں چاہتا تھا کہ آپؐ خدائے تعالیٰ کے رسول ہیں، بلکہ اس لئے کہ آپؐ کے غلبہ اور تفوّق حاصل کرنے میں خود اُس کی اپنی عزّت اور تفوّق کا راز مضمر تھا ۔ لیکن جب اُس کی موت کا وقت قریب آ گیا اور دُنیاوی تفوّق کے متعلق اس کی تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں تو اُس نے اپنے آباؤ اجداد کے دین پر قائم رہنے کو بھتیجے کی رضامندی حاصل کرنے پر ترجیح دی اور توحید و رسالت کا اقرار کرنے سے انکار کر دیا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُس کی محبت ابوبکر صدیق، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دیگر مومنوں کی طرح نہیں تھی، جو آپؐ کو اس لئے

محبوب سمجھتے تھے کہ آپؐ خدا کے برگزیدہ سچے رسول ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى - (۹۲: ۱۷ تا ۲۱)

عنقریب اس (دوزخ) سے وہ بڑا پرہیزگار بچا لیا جائیگا، جو اپنا مال تزکیہ حاصل کرنے کو دیتا ہے اور کسی کا اس پر احسان نہیں تھا کہ اسکا وہ بدلہ اتارتا ہے صرف اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کو خرچ کرتا ہے۔ وہ جلد راضی ہو جائیگا۔

اور یہی وجہ تھی کہ ابوطالب کے تمام اعمال آنحضرت صلعم کی سرپرستی اور آپؐ کی نصرت و تائید سب اکارت ہو گئے، کیونکہ اُن اعمال سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا اُس کا مقصود نہیں تھا۔

ضرورت ایمان اور توحید

اس سے صاف اور واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ایمان اور توحید میں تصدیق قلبی کے ساتھ ساتھ عمل قلبی کی بھی ضرورت ہے۔ پس دین خالص وہی ہے جو اللہ کے لئے ہو۔ اور دین کامل نہیں ہوتا جب تک اُس کے ساتھ عمل کی تصدیق شامل نہ ہو۔ کیونکہ دین طاعت اور عبادتِ الٰہی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں دو سورتیں توحید کے بارے میں نازل فرمائی ہیں۔ ایک سورۂ اخلاص اور دوسری سورۂ قُل یا ایُّہا الکافرون۔ ان میں سے پہلی سورۃ توحید عملی اور توحید قولی پر مشتمل ہے۔ جیسے فرمایا:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ - (۱۱۲: ۱ تا ۴)

(اے نبیؐ) فرما دیجئے، اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اُس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ کوئی اُس کا باپ، اور نہ کوئی اُس کا ثانی و ہمسر ہے۔

اور دوسری سورہ کا مضمون ارادہ اور عمل کی توحید ہے۔ جیسے فرمایا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ

(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے قوم کفار! میں اُس کی پرستش

---

[1] تمام مفسرین کے نزدیک یہ آیت حضرت ابوبکرؓ کے حق میں نازل ہوئی ہے، اور آپ کا سارا مال و دولت رضائے الٰہی کے حصول میں رسول اللہ صلعم کے لئے وقف تھا۔ (ناشر)

مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ، وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ، لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِیَ دِيْنِ۔ (۱۰۹ : ۱ تا ۶)

نہیں کرتا، جس کی تم عبادت کرتے ہو، اور تم اُس کی عبادت نہیں کرتے، جس کو میں پوجتا ہوں۔ اور نہ میں اس کی عبادت کرونگا جسے تم پوجتے ہو اور نہ تم اُسکی عبادت کرنیوالے ہو، جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین۔

پہلی سورہ میں اُن صفاتِ عُلیا کا بیان ہے، جس سے علمی توحید کے مختلف پہلو واضح ہوتے ہیں اور دوسری میں غیر اللہ کی عبادت سے بیزاری کا نہایت مؤکد اظہار ہے اور یہ کہ عبادت خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

فصل ۴

توکل اور عبادت کا مفہوم

دلیل مغائرت جیسے کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، بعض الفاظ مثلاً ایمان وغیرہ ایسے ہیں کہ جب وہ کسی دوسرے لفظ مثلاً اسلام وغیرہ کے مقابلے میں مذکور ہوں، تو اُن کا مفہوم محدود ہوتا ہے۔ لیکن الگ استعمال کئے جانے کی حالت میں اُن کا مفہوم بہت وسیع ہوتا ہے۔ اسی طرح عبادت کا لفظ بھی اگر توکل وغیرہ سے علیحدہ استعمال کیا جائے تو توکل اور دُوسرے مقامات اُس کے مفہوم میں داخل سمجھے جاتے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ (۵۱ : ۵۶)

جنوں اور انسانوں کو میں نے اِسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اور فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ (۲ : ۲۱)	اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔

یہاں جو عبادت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہ تمام مامورات کی بجا آوری اور تمام منہیات سے باز رہنے کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ لیکن ایک دوسری جگہ توکل کو اس پر عطف کیا گیا ہے جو مغایرت کی دلیل ہے۔ فرمایا ہے:

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (۱۱ : ۱۲۳)	تم اللہ ہی کی عبادت کرو اور اُسی پر بھروسہ رکھو۔
إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ۔ (فاتحہ)	ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

یہاں عبادت کا مفہوم محدود ہے۔

معانیِ عموم وخصوص اس قسم کے اور بھی الفاظ قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں۔ جو کبھی عموم اور کبھی خصوص کے معنی دیتے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک لفظ "منکر" ہے جو اکثر "معروف" کے مقابلے میں استعمال ہو کر عموم کے معنے دیتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں سے خطاب ہے کہ اُن کا مشن اصلی کیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۳ : ۱۱۰)	تم بہترین اُمت ہو، اس لئے پیدا کئے گئے ہو کہ لوگوں کو نیکی کا حکم دو، اور بُرائی سے منع کرو۔

یا جیسے رسولِ خدا کو حکم ہوا کہ یہود و نصاریٰ سے اس طرح خطاب کریں:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۷ : ۱۵۷)	آپ اُن کو نیک کام کا حکم کریں اور بُرے کاموں سے منع کریں۔

یعنی ہر ایک ایسی بات کہ عقل، شرع اور فطرت اس کا انکار کرے اور اُس کو بُرا سمجھے، اُسے منکر سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں ہر قسم کی بے حیائی بھی داخل ہے۔ لیکن ایک مقام پر بے حیائی کو

اِس کا معطوف علیہ بنایا ہے جو اِس بات کا قرینہ ہے کہ "منکر" کو محدود مفہوم کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ (۲۹ : ۴۵)	بیشک نماز کی پابندی انسان کو بے حیائی اور دوسرے بُرے کاموں سے روکتی ہے ۔

اور فرمایا :

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۔ (۱۶ : ۹۰)	بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم انصاف کرو، احسان کرو، رشتہ داروں کو کچھ دیا کرو، بے حیائی اور بُرے کاموں سے بھی وہ تم کو منع کرتا ہے ۔

اسی طرح فقرا، اور مساکین کا لفظ اگر ساتھ ساتھ استعمال کیا جائے تو اِن دونوں کے مفہوم میں فرق ہوتا ہے، لیکن الگ الگ استعمال ہوں تو ایک کا مفہوم دُوسرے کے مفہوم میں داخل سمجھا جاتا ہے ۔

مفہومِ محبّت، توکّل، خوف

الغرض خالص اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبّت رکھنا، فقط اسی کی ذات پر بھروسہ کرنا، صرف اُسی سے ڈرنا اور کسی دُوسرے کا خوف دِل میں نہ لانا، یہ سب باتیں توحید کے مفہوم میں داخل ہیں۔ محبّت کے بارے میں یہ آیت کئی بار پہلے ذکر ہو چکی ہے کہ :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔ (۲ : ۱۶۵)	بعض لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو اُس کا شریک بناتے ہیں اور اُن کے ساتھ خدا کی طرح محبّت رکھتے ہیں، لیکن جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ اللہ کے ساتھ اُن سے زیادہ محبّت رکھتے ہیں ۔

اور فرمایا :

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ۔ (۹ : ۲۴)

(اے نبی) ان سے کہو کہ اگر تمہارے باپ تمہارے بیٹے اور بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارا جمع کیا ہوا مال اور تمہاری تجارت کہ جس کی کساد بازاری کا خوف رکھتے ہو اور تمہارے پسندیدہ مکان اگر تمہیں اللہ اور اُس کے رسولؐ سے اور اللہ کے رستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو اُس وقت کے منتظر رہو جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم کو تمہارے سامنے لے آئے۔

اور فرمایا:

وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ۔ (۲۴ : ۵۲)

اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی طاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اُسی کی خاطر پرہیزگاری کرے پس ایسے لوگ ہیں کامیاب ہونگے۔

یہاں طاعت کو اللہ اور رسول دونوں کے لئے بیان فرمایا اور خشیت اور تقویٰ کو صرف اللہ کے لئے مقرر رکھا۔ اور فرمایا:

وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ۔ (۹ : ۵۹)

اور اگر وہ اللہ اور اُس کے رسول کے دئے ہوئے پر راضی ہو جاتے اور کہہ دیتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے، اور وہ اور اس کا رسول اپنے فضل سے جلدی ہی اور زیادہ دیدیں گے اور ہم اللہ کی طرف ہی راغب ہیں۔

اور فرمایا:

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ، وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ۔ (۹۴ : ۸)

(اے نبیؐ) جب (تبلیغ سے) فراغت پاؤ تو ریاضت کرو اور اپنے رب کی طرف رغبت کرو۔

یہاں حسبت اور رغبت صرف اللہ کے لئے قرار دی۔

دوسری جگہ خالص اللہ تعالیٰ کے لئے محبت رکھنے کے نتیجہ کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ۔ (۵۸ : ۲۲)

تم کوئی ایسی قوم نہیں پاؤ گے جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے ہوں اور پھر وہ اُن لوگوں سے محبت کریں جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، چاہے وہ لوگ اُن کے سگے باپ یا بھائی ہوں، یا اُن کے عزیز لخت جگر یا قبیلہ کے آدمی ہوں۔

توکل کے متعلق کئی جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (۵ : ۲۳)

اگر تم مومن ہو تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر بھروسہ رکھو۔

خشیت کے باب میں ارشاد ہوتا ہے:

وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ۔ (۳۳ : ۳۹)

(اللہ کے رسول) اللہ ہی سے ڈرتے ہیں اور سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کا خوف دل میں نہیں لاتے۔

اِن سب باتوں کو ہم نے کسی دوسری جگہ پر پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

خلاصۂ بحث

یہاں پر ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس قول میں کہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ" توحیدِ اُلوہیت کا اعتراف ہے اور اس کے مفہوم میں قلب کی تصدیق اور اس کا عمل دونوں شامل ہیں۔ مشرکین عرب کو اس بات کا اقرار تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی سب اشیاء کا خالق اور رازق ہے، لیکن وہ الوہیت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے تھے۔ حالانکہ توحیدِ الوہیت کے یہ معنے ہیں کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کی عبادت نہ کی جائے اور سوائے اُس کے اور کسی کو قبلۂ حاجات نہ ٹھہرایا جائے۔ روزمرہ

ہر ایک نماز کی ہر ایک رکعت میں " اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ " کہہ کر اسی عقیدہ کا اظہار اور اس کی تجدید کی جاتی ہے۔

فصل ۵

نام نہاد صوفیہ کو نصیحت

غیر مشروع توجہات

بعض اوقات آدمی صرف اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہے اور اُسی کی ذاتِ پاک پر اس کا بھروسہ ہوتا ہے۔ لیکن اُس کا یہ سوال اور اس کا یہ توکل اُن اُمور کی بابت ہوتا ہے، جن کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا، بلکہ اُن سے اُس کو منع فرمایا ہوتا ہے۔ اِس سے ہماری مراد وہ نام نہاد صوفیہ ہیں جو غیر مشروع "توجہات" کے عامل ہیں، اور اُن کا کشف اور تصرف اُن اُمور سے تعلق رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے خلاف ہیں۔

اُن کا مطمحِ نظر

اکثر اُن میں سے اللہ تعالیٰ ہی سے مدد کے خواہاں ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسُول کی اطاعت نہیں ہوتی، اِس لئے وہ دُنیاوی زندگی میں کامیاب ہوں تو ہوں، لیکن آخرت میں اُن کو کسی بہتری کی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ۔ (۱۷ : ۶۷)	جب تم کو سمندر میں مصیبت پہنچتی ہے تو تم جن کی خدا کے سوا عبادت کرتے ہو، انہیں بھول جاتے ہو، پھر جب تمہیں خشکی پر بچا لاتا ہے تو اُس سے اعراض کر لیتے ہو۔ بیشک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

اور فرمایا:

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَّسَّهُ۔ (۱۰ : ۱۲)

جب انسان کو مصیبت پہنچتی تو وہ ہمیں پکارنے لگتا ہے، خواہ پہلو پر لیٹا ہو یا بیٹھا ہو یا کھڑا ہو۔ پھر جب ہم اُس کی مصیبت دُور کر دیتے ہیں تو اس طرح گزر جاتا ہے گویا اُس نے ہمیں اس مصیبت کیلئے پکارا ہی نہ تھا جو اُسے پہنچی تھی۔

اصلاحِ حال کی راہ

اس لئے اپنی آخرت کو سنوارنے کے لئے اپنی زندگی کی جملہ حرکات و سکنات کو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسُول کی اطاعت اور اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وقف کر دینا لازم ہے۔

وَاللّٰهُ وَرَسُولُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (۹ : ۶۲)

اگر یہ لوگ مومن ہوں تو سب سے مقدم اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسُول کی خوشنودی حاصل کرنا ان پر لازم ہے۔

سالکانِ راہ کی کوتاہیاں

بعض دوسرے لوگوں کا نصب العین اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسُول کی اطاعت ہوتی ہے، لیکن توکل اور استعانت باللہ کے مقام سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اُن لوگوں کو اپنی نیک نیتی اور خدا و رسول ﷺ کی اطاعت کا یقیناً ثواب ملیگا۔ لیکن جب تک وہ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کرنے اور اسی کی ذاتِ پاک پر بھروسہ رکھنے میں ثابت قدم نہ ہوں، اوّلاً تو ان کی کامیابی مشکوک ہے اور اس لئے بعض اُن میں سے اثنائے سلوک میں ہمّت ہار جاتے ہیں۔ ثانیاً اگر وہ منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو خود بینی میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی نُصرت اور تائید سے محروم رہ جاتے ہیں۔ انہی حالتوں پر یہ آیت شریفہ صادق آتی ہے کہ:

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا

اور جب جنگِ حنین کے دن تم کو تمہاری کثرت نے مغرور کر دیا تو تمہیں کوئی چیز کفایت نہ کر سکی اور اس سبب

وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ - (۹ : ۲۵)	شکست کھے) زمین بھی تم پر تنگ ہوگئی اس لئے کہ تم نے خدا کا توکل چھوڑ دیا۔ پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔

اِس کے بعد فرمایا:

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ - (۹ : ۲۷)	پھر اللہ اس کے بعد جس کی چاہیگا، اپنی رحمت سے توبہ قبول کرلے گا، اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔

امراضِ ریاء و عُجب کا علاج

اکثر اوقات ریاء اور عُجب (نمود اور خود بینی) کی صفت ایک ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی حقیقت ایک دوسرے کے قریب قریب ہے۔ ریاء میں کسی دوسری مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنایا جاتا ہے[۱] اور عُجب میں اپنے نفس کو خدا کا شریک ٹھہرایا جاتا ہے[۲]۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ پہلے مرض کا علاج ہے اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ دوسرے روگ کے استیصال کے لئے ہے۔ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ:

ثلاث مُهلكات: شح مطاع، وهوى متبع، واعجاب المرء بنفسه۔	تین چیزیں انسان کو ہلاک کردیتی ہیں: بخل اور حرص کے محرک پر عمل کرنا، خواہش نفس کی پیروی کرنا اور خود بین ہو جانا۔

جھوٹے پیروں کا فرقہ

اِن دونوں فرقوں سے بدتر ایک اور فریق ہے، جن کی نہ تو عبادت اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتی ہے اور نہ وہ اللہ تعالیٰ سے استعانت کرتے ہیں۔ اُن کی عبادت غیر اللہ کے لئے اور استعانت غیر اللہ سے ہوتی ہے۔ اس لئے یہ لوگ دونوں لحاظ سے مشرک ہیں۔ انہی میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو شیاطین سے

---

[۱] یعنی جو کام صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کرنا چاہئے تھا، وہ دوسروں کی نمائش کے لئے کیا جاتا ہے۔

[۲] خدائے تعالیٰ کی تائید اور اعانت اور اُس کی توفیق اور عنایت اُس کو ملحوظ نہیں رہتی بلکہ وہ اپنی ہی قوت پر نازاں ہوتا ہے اور قارون کی طرح سمجھنے لگتا ہے کہ: انما اوتیتہ علی علم عندی۔

استعانت کرتے ہیں اور ایسے اعمال بجالاتے ہیں جن کو شیاطین پسند کرتے ہیں مثلاً کذب اور فجور۔ نیز وہ ان الفاظ میں دُعائیں کرتے ہیں جن کو شیطانی القا کا نتیجہ کہیں تو بجا ہوگا۔ اور ایسے عملیات کا ورد کرتے ہیں جن کی وجہ سے شیطان اُن کے مطیع ہو جاتے ہیں ۔ بعض اوقات اُن لوگوں سے اس قسم کے افعال سرزد ہوتے ہیں اور اُن کے ہاتھ پر ایسے واقعات اور کیفیات ظہور میں آتی ہیں، جن کو ان کے معتقدین خارقِ عادت ہونے کی وجہ سے ولایت اور کرامت خیال کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ سحر اور کہانت کی ایک قسم ہے ۔ مؤمنوں کو چاہیئے کہ وہ احوالِ ایمانیہ اور احوالِ شیطانیہ میں فرق کر لیا کریں۔

عقیدۂ اہلِ توحید

چوتھی جماعت اہلِ توحید کی ہے، جن کا دین خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتا ہے۔ وہ اُسی کی عبادت کرتے اور اُسی کی ذاتِ پاک پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ کسی مصیبت زدہ کا یہ قول کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ یہ بھی احتمال رکھتا ہے ہے کہ اُس کے قائل کے مدِنظر ایک ہی قسم کی توحید ہو (مثلاً توحیدِ ربوبیت)، لیکن جس پر اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت ہو، وہ دونوں قسم کی توحید کو ملحوظ رکھتا ہے۔ جو مصیبت زدہ اور صاحبِ حاجت شخص لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ کہتے ہوئے صرف اس بات کا استحضار کرتا ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی بھی ضرر کا دفع کرنے والا نہیں، اور نعمتیں بھی وہی نازل فرماتا ہے، تو اُس کا یہ عقیدہ، توحیدِ ربوبیت پر مبنی ہے۔ سوال، طلب اور توکل کے لحاظ سے بھی وہ موحد ہے، لیکن توحیدِ اُلوہیت کا مقام اس سے بالاتر ہے۔

توحیدِ اُلوہیت کا مقتضٰے یہ ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کی عبادت نہ کرے، اور نیز اُس کی عبادت اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسوؐل کی تعلیم کے موافق اور اُن کی اطاعت پر مبنی ہو۔ ایسا شخص اس آیت شریفہ پر عامل ہے :

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (۱۱ : ۱۲۳) | اُسی کی عبادت کرو اور اُسی پر بھروسہ رکھو۔

اور فرمایا :

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۔

(۱۱ : ۸۸)

میرا اُسی (خدا کی) ذات پر بھروسہ ہے اور اُسی کی طرف مجھے لوٹ کر جانا ہے ۔

اور فرمایا :

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۚ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ۔

(۷۳ : ۸، ۹)

اور یاد کر نام اپنے پروردگار کا اور جھک جا اس کی طرف پورا جھکنا ۔ وہی رب ہے مشرق اور مغرب کا نہیں ہے کوئی معبود اُس کے سوا پس اُسی رب کو اپنا کارساز پکڑ ۔

ایسے شخص کا مطلوب اگر کوئی حرام چیز ہے تو وہ اُس کے لئے سوال اور طلب کرنے کی وجہ سے گناہگار ہوگا، چاہے اُس کی حاجت پوری ہو جائے ۔ اور اگر وہ کسی مباح چیز کا طلبگار ہے تو اس کے لئے ثواب یا عذاب کچھ نہیں لیکن اگر وہ کسی ایسی چیز کو خدائے تعالیٰ سے مانگتا ہے جو عبادت میں اُس کے لئے معاون ہے تو بے شک ایسے شخص کو اجر ملے گا ۔

فصل ۶

بندہ پیغمبر اور بادشاہ پیغمبر

آنحضرتؐ کی ترجیح

اس تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ "بندہ پیغمبر" اور "بادشاہ پیغمبر" میں کیا فرق ہے ؟ وہ حدیث تمہیں یاد ہوگی جس میں اس بات کا ذکر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا گیا کہ وہ بندہ اور پیغمبر ہو کر رہیں یا بادشاہ پیغمبر کی زندگی بسر کریں۔ چنانچہ آپؐ نے بندہ پیغمبر کی زندگی کو ترجیح دی ۔

حکمِ مُرسل کی تعمیل و تبلیغ

"بندہ پیغمبر" کے یہ معنی ہیں کہ اُس کے تمام حرکات وسکنات اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ہوتے ہیں، وہ کوئی ایسا فعل نہیں کرتا، جس کی بابت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کو حکم نہ دیا گیا ہو[۱]۔ اِس لئے بندہ پیغمبر کا ہر ایک فعل (حرکت او رسکون) عبادت ہے، وہ محض بندہ ہوتا ہے، جس کا یہ کام ہوتا ہے کہ اپنے مُرسل کے احکام کی تعمیل اور تبلیغ کرے۔

صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول منقول ہے کہ:

انی واللہ لا اعطی احدا و لا امنع احدا وانما انا قاسم اضع حیث امرت

خدا کی قسم! میں نہ کسی کو کوئی چیز دیتا ہوں اور نہ ہی کسی چیز کا دینا روکتا ہوں۔ بیشک میں صرف تقسیم کرنے والا ہوں، جو کچھ مجھے حکم ہوتا ہے اُس کی تعمیل کرتا ہوں۔

آپؐ کا منع اور عطا

آپؐ کا یہ قول کہ "میں کسی کو کچھ نہیں دیتا اور نہ ہی کسی چیز کا دینا روکتا ہوں" اس بناء پر نہیں کہا گیا کہ قضاء و قدر نے آپؐ کو مسلوب الاختیار کر رکھا ہے، کیونکہ جہاں تک قضا و قدر کا تعلق ہے، اس میں سب برابر ہیں، آپؐ کی کچھ بھی خصوصیت نہیں۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ شرعاً دینے یا نہ دینے میں میرا کچھ دخل نہیں بالفاظِ دیگر، میں اُسی کو دیتا ہوں، جس کے دینے کا مجھے حکم ہوتا ہے، اور وہی چیز کسی سے روکتا ہوں، جس کے روکنے ہی کا مجھ کو حکم دیا جاتا ہے۔ یعنی جس طرح میرے تمام افعال اور حرکات اُس کی قضا و قدر کی صفتِ تکوین کے ساتھ وابستہ ہیں، اُسی طرح میرے تمام حرکات وسکنات (دینا اور نہ دینا وغیرہ وغیرہ) اس کے احکام تشریعی کے تحت میں ہیں۔ الغرض میں عطا اور منع دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کے احکام کا انتظار کرتا ہوں اور حکم ملنے پر اس کی تنفیذ کرتا ہوں۔ اموالِ صدقہ اور اموالِ غنیمت وغیرہ کو اپنی رائے کے موافق

---

[۱] لیکن بادشاہ پیغمبر اپنی مرضی میں اس حد تک آزاد ہوتا ہے، جس حد تک اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اُس کی رضامندی کے خلاف نہ ہو۔ اس دقیق فرق کو بخوبی سمجھ لو۔ مترجم

نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تقسیم کرتا ہوں۔

فقہا کی غلط توجیہیں

اسی سلسلہ میں یہ نکتہ بھی یاد رکھو کہ قرآن کریم میں جہاں مال کی اضافت اور نسبت اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسُول کی طرف کی گئی ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ اُس مال کو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسُول کی اطاعت میں خرچ کیا جائے۔ اور جیسے کہ بعض فقہاء کا قول ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ مال کی تکوین اور تخلیق کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا ہے۔ کیونکہ اس لحاظ سے تو ہر ایک مال اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، مالِ غنیمت کی کیا تخصیص ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔ (۸ : ۱)	اے نبی! فرما دیجئے: مالِ غنیمت تو اللہ اور اُس کے رسول کا حق ہے۔

اور فرمایا:

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ۔ (۸ : ۴۱)	لوگو! تم اس بات کو بخوبی سمجھ لو کہ جو کچھ مال و دولت غنیمت کے طور پر تم کو حاصل ہو، تو بلا شبہ اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اُس کے رسول کا حق ہے۔
وَمَا اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَا اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ۔ (۵۹ : ۵)	اور مالِ فَیٔ جو اللہ نے اپنے رسول کو دلا دیا ہے، اس طرح پر کہ تم کو اس پر گھوڑے اور اونٹ دوڑا کر فوج کشی نہ کرنی پڑی، بلا محنت و مشقت حاصل ہُوا ہے۔
اِلیٰ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى۔ (۵۹ : ۶)	(بنو نضیر خیبر والوں کی بستی ختم ہوئی) تو اس سے جو مال بغیر لڑائی کے حاصل ہُوا ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول کا حق ہے تاکہ ذوالقربیٰ (وغیرہ) کو دیا جائے۔

اسی طرح یہ بھی مراد نہیں کہ وہ مال رسُول کی ملک ہے، جس طرح چاہے اس میں تصرّف کرے۔ جن فقہاء کا یہ قول ہے انہوں نے متعدّد وجوہ سے غلطی کی ہے:

پہلی تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اموالِ غنیمت اور دیگر اموال کے نہ تو اِس طرح مالک تھے جس طرح عام لوگ اپنی کسی مملوک چیز کے مالک ہوتے ہیں اور نہ ہی آپ کو وہ حقِ تصرف حاصل تھا جو بادشاہوں کو شاہی خزانہ کا مال صرف کرنے کی بابت حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ عام لوگ اپنے اموال کو اپنی ذاتی اغراض کے حصول کے لئے خرچ کرتے ہیں اور بادشاہ اور سلاطین اپنی اور اپنے وزراء کی رائے اور صوابدید کے مطابق مصالح ملک و ملت کو ملحوظ رکھ کر اپنے خزانہ کو صرف میں لاتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "بندہ پیغمبر" ہونے کی وجہ سے اس قسم کا تصرف نہیں کرتے تھے؛ بلکہ عطا اور منع دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر عملدرآمد فرماتے تھے۔ اس لئے آپ کی ہر ایک حرکت اور سکون عبادت تھی۔ بعض فقہاء کا خیال ہے کہ رسول اللہ کو خمس میں تصرف کرنے کا حق حاصل تھا، جیسے امام شافعی، امام احمد اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہم کے اقوال میں پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔

دوسرے یہ کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مال، میراث کے طور پر اُن کے وارثوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔ اِس حکم میں تمام انبیاء یکساں ہیں، چاہے وہ بادشاہ پیغمبر ہوں یا بندہ پیغمبر۔ اور کوئی نبی یا رسول مال کا مالک نہیں ہوتا، جس طرح دوسرے عام لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُن کا مال، میراث کے طور پر تقسیم نہ ہونے سے یہ امر زیادہ واضح ہوتا ہے۔ اب تم خود سوچ لو کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جو بادشاہ پیغمبر نہیں، بلکہ بندہ پیغمبر تھے، کس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی مال آپ کی ملک تھا۔ اور اگر آپ بادشاہ پیغمبر ہوتے تو آپ کو مصلحتِ ملکی میں خرچ کرنے کا حق حاصل ہوتا جیسے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا حال تھا۔ فرمایا:

هٰذَا عَطَاۗؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ (۳۸ : ۳۹)

یہ ہماری بخشش ہے، اب تم جس کو چاہو، بخش دو یا روک رکھو۔ یہ بے حساب مال و دولت ہے۔

تیسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جان اور اپنے عیال پر بقدرِ ضرورت خرچ کرتے اور باقی سب مال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے راہِ خدا میں صرف فرماتے تھے، اپنے پاس کچھ بھی ذخیرہ نہیں فرماتے تھے۔ لیکن تم جانتے ہو کہ عام مالکوں کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف میں جس قدر مال تھا، وہ سب اللہ اور رسولؐ کا مال تھا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس مال کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرتے اور اللہ تعالیٰ ہی کے احکام کے موافق اُس کی تقسیم فرماتے تھے۔

آنحضرتؐ کا اجتہاد اور حکم صریح

چوتھے: البتہ جن اموال کو وہ اس طرح مستحقین میں تقسیم فرماتے، وہ دو قسم کے تھے: ایکؔ وہ جن کے مصرف کی بابت آپؐ کو صریح حکم ملتا۔ دوسرے وہ جن کا صرف کرنا آپؐ کے اجتہاد اور صوابدید پر مفوض کیا جاتا۔ جیسے کہ دوسرے امورِ شرعیہ میں بھی بعض چیزیں یعنی اُن کے احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے معین اور محدود ہوتے ہیں، مثلاً نمازِ پنجگانہ اور سال بھر میں ایک مہینہ روزے رکھنا وغیرہ۔ لیکن بعض چیزوں کے متعلق مختص الوقت اور مختص المکان مصالح کو ملحوظ رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اجتہاد کے بموجب عمل پیرا ہوتے تھے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ اجتہاد بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے موافق اور اُسی کی طرف سے تلقین پر مبنی ہوتا تھا۔ مثلاً بیوی کا نفقہ شرع کی طرف سے بلحاظ مقدار اور نوعیت کے مقرر نہیں بلکہ اِس کی مقدار اور اس کی نوعیت کی تعیین عُرف پر چھوڑ دی گئی ہے جو لوگوں کے مختلف طبقات کے مختلف طرز ہائے معاشرت کا لحاظ کر کے کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ جمہور فقہا قولِ ثانی کے مؤید ہیں اور یہ درست ہے۔ کیونکہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ہندہ سے فرمایا تھا:

خُذی ما یکفیکِ وولدکِ۔	اس قدر کفاف لے لو جو تمہارے لئے اور تمہارے بچے کے لئے کافی ہو۔ دستور کے مطابق۔

نیز عرفہ کے دن خطبہ میں فرمایا:

لِلنِّسَاءِ كِسْوَتُهُنَّ وَنَفَقَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔	عورتوں کے لئے کپڑا پہنانا اور انہیں نان نفقہ دستور کے مطابق دیا جائے۔

صوابدید رسولؐ اور حکمِ الٰہی

الغرض، جن اموال کی اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اضافت اور نسبت کی گئی ہے۔ اُس کی تقسیم اور اس کا اعطاء و منع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صوابدید پر منحصر ہے۔ برخلاف اُس کے بعض اموال مستحقین کو خود اللہ تعالیٰ نے معین فرما دیا ہے اور اُن کا حصہ بھی معلوم کر دیا ہے، جس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں، مثلاً مالِ میراث کی تقسیم۔ اسی اصول کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ حنین کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا:

لَيْسَ لِيْ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ اِلَّا الْخُمُسَ وَالْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ عَلَيْكُمْ۔	جو کچھ تم کو اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت دیا ہے، اُس میں میرا کچھ بھی نہیں، البتہ اس کا پانچواں حصہ میرا ہوتا ہے اور وہ بھی تم پر لوٹا دیا جاتا ہے۔

اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ ⅘ حصہ مالِ غنیمت کا حکم تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معلوم اور معین ہے کہ وہ اُن لوگوں کا حق ہے جو واقعہ میں حاضر تھے۔ صرف ⅕ حصہ ایسا ہے جس کا صَرف کرنا میرے اجتہاد اور صوابدید پر رکھا گیا ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا تو اس خُمس میں تصرف کرنا خلفائے راشدین کا حق قرار پایا، جس کو وہ اپنی صوابدید کے مطابق مستحقین میں تقسیم فرمایا کرتے تھے۔ نبی صلعم نے جنگِ حنین کے موقع پر جو کچھ مالِ غنیمت تالیفِ قلوب کے لئے دیا اور فرمایا یہی خمس ہے اور مالِ غنیمت کی اصلی تقسیم ہے۔ اور دراصل مومنین کے دل کو خوش کرنے کو فرمایا۔ اور اسی لئے جب انصار میں سے کسی نے الزام لگایا۔ اور جب الزام رفع ہوا تو آپؐ نے یہی جواب دیا اور انہیں انعام دینا چاہا۔

بعض اہلِ علم کہتے ہیں کہ مالِ غنیمت تقسیم سے قبل غازیوں کی ملکیت نہیں ہوتی اور یہ امام المسلمین کا حق ہے کہ وہ اپنے اجتہاد اور صوابدید سے خرچ کرے۔

باب ۵

دُعائے یُونسؑ اور توحیدِ اُلوھیت

فصل ۱

عبادت اور دُعا کا مفہوم

رجوع الی المقصود یہ ایک طردُ اللباب بات درمیان میں آگئی تھی۔ دراصل بتانا یہ تھا کہ جو خدائے تعالیٰ کے سچے بندے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرتے اور اسی سے اعانت طلب کرتے ہیں اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے مضمون پر کما حقہٗ عمل پیرا ہوتے ہیں اور توحیدِ ربوبیّت اور توحیدِ اُلوہیّت دونوں اُن کے عقیدے اور عمل میں شامل ہوتی ہیں۔ کیونکہ جب دونوں الگ الگ استعمال ہوتی ہیں تو دوسری کے مفہوم کو لئے ہوتی ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، اِلٰهِ النَّاسِ۔	کہہ دے اے نبی! میں لوگوں کے پروردگار، لوگوں کے بادشاہ اور لوگوں کے معبود کی پناہ میں آتا ہوں۔

نیز فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔	سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے

تقدیم و تاخیرِ عبادت و استعانت عبادت دراصل غایت اور مقصود بالذات ہے جس کے لئے مخلوقات کو خدا نے پیدا کیا اور ربوبیت اور اعانت اُس کے

حصول اور تکمیل کا ذریعہ اور وسیلہ ہے لیکن عبادت پہلے اس لئے مذکور ہے کہ مومن آدمی جب اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہتا ہے تو وہ ابتدائے عبادت کا قصد کرتا ہے اور اپنے قصد اور ارادہ کی ترجمانی اس عبارت سے کرتا ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ لیکن وہ بالیقین جانتا ہے کہ اللہ تعالٰے کی توفیق اور اعانت کے بغیر اس اہم مقصد میں کامیاب ہونا ناممکن ہے۔ اس لئے فوراً اُس کی زبان پر وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ جاری ہوتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ علتِ غائی اور علتِ فاعلی میں ایک معروف و معلوم فرق ہے۔

موزوں ترین اسماءِ الٰہی

ساتھ ہی یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ عبادت کے ساتھ "اللہ" کے اسم پاک کو خاص مناسبت ہے، کیونکہ اس کی عبادت اُس کی صفتِ الوہیت کا مقتضٰے ہے لیکن سوال اور درخواست کے موقع پر "ربّ" کا اسم پاک موزوں تر ہے۔ کیونکہ اپنے بندے کے حوائج پورے کرنا اور اس کی اعانت کرنا اور اس کو توفیق بخشنا اُس کی صفتِ ربوبیت کا ظہور ہے۔

انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور مومنوں کی جتنی دُعائیں قرآن کریم میں منقول ہیں، وہ سب "رَبَّنَا" اور "رَبِّ" کے لفظ سے شروع ہوتی ہیں۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا کی دُعا:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ۔ (۷: ۲۳)	اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم بہت خسارہ پانے والوں میں سے ہوں گے۔

اور حضرت نوح علیہ السلام کی دُعا:

رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ۔ (۱۱: ۴۷)	اے پروردگار! میں اس بات سے تیری پناہ لیتا ہوں کہ تجھ سے ایسا سوال کروں جو میرے علم سے باہر ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا:

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ (۲۸ : ۱۶)

اے پروردگار! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے، تو مجھے بخش دے۔

اور :

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ۔ (۲۸ : ۲۴)

اے پروردگار! جو کچھ تو مجھے دیدے، بیشک میں اُس کا محتاج ہوں۔

ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام من اللہ الجلیل کی دُعا :

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ، رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ (۱۴ : ۳۷)

اے میرے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو ایسی وادی میں لبا دیا ہے جو غیر آباد ہے اور تیرے محترم گھر کے پاس ہے۔ اے پروردگار! تاکہ میری اولاد نماز کو قائم کرے۔

نیز حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی مشترکہ دُعا :

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَھَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ (۳۸ : ۳۵)

اے پروردگار! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو اُس طرح کی سلطنت نہ ملے۔ بیشک تو بڑا عطا کنندہ ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دُعا :

رَبِّ ھَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ۔ (۳۸ : ۳۵)

اے پروردگار! مجھے ایسی سلطنت عنایت فرما کہ میرے بعد کسی کو اُس طرح کی سلطنت نہ ملے۔ بیشک تو بڑا عطا کنندہ ہے

مومنوں کی یہ دعائیں ملاحظہ ہوں :

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (۲ : ۲۰۱)

اے میرے پروردگار! مجھے دُنیا اور آخرت کی بھلائی عطا فرما اور عذاب دوزخ سے بچا۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا۔ (۳ : ۸)	اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت دینے کے بعد ٹیڑھا نہ کر دینا۔

اولی الالباب کی دعاؤں کا اس طرح ذکر کیا ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً، سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (۳ : ۱۹۱)	اے ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے رائگاں پیدا نہیں کیا۔ تیری ذات پاک ہے، پس ہمیں عذاب دوزخ سے بچالے۔

وغیرہ وغیرہ بکثرت آیات موجود ہیں جو سب اسی طرح شروع ہوتی ہیں۔

حضرت امام مالکؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ اس کو سخت برا جانتے تھے کہ آدمی اپنی دعا میں کہے: یا سیّدی یا سیّدی، یا حنّان یا حنّان۔ بلکہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیشہ انہی الفاظ سے دعا کرو، جن سے انبیاء نے دعا کی ہے اور کہو "ربّنا، ربّنا"۔

داعیۂ تخاطب الٰہی

الغرض جب آدمی کے دل میں سوال اور درخواست کا خیال غالب ہو تو ربّ کے لفظ سے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرنا مناسب ہوگا۔ اگرچہ سوال بھی خدا کے اسم "اللہ" ہی کے ذریعہ کرنا مستحسن ہے، کیونکہ اللہ ذاتی نام ہے، جو اسم ربّ کو شامل ہے۔ لیکن جب اس کے دل میں عبادت کا خیال ہو، تو پھر اللہ کا لفظ استعمال کرنا زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔ جب خدا کی تعریف کرے تو اللہ ہی کا ذکر کرے اور جب دعا کا ارادہ کرے تو بھی اللہ ہی کو پکارے۔

فصل ۳

اقرارِ گناہ کی تقدیم و تاخیر

حضرت یونسؑ اور آدمؑ کا جُرم

یہاں پر ایک سوال[1] پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے پہلے توحیدِ الوہیت کا اعتراف کیا اور بعد ازاں اپنے گناہ کا اقرار کیا، (لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ) لیکن آدم علیہ السلام کی دُعا میں بغیر کسی تمہید کے گناہ اور قصور کا اعتراف ہے (رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ) ۔

اِس میں نکتہ یہ ہے کہ یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو نزولِ عذاب سے ڈرایا تھا اور عذاب کے آثار ظاہر بھی ہو چلے تھے لیکن جب اُنہوں نے سچے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور ایمان لائے تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے اپنا عذاب ہٹا دیا۔ یونس علیہ السلام نے عذاب کو ٹلتا ہُوا دیکھ کر یہ خیال کیا کہ اس سے وہ اپنی قوم کی نظروں میں جھوٹے ثابت ہو نگے[2]۔ اِس لئے وہ جھنجلائے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کئے بغیر قوم کو چھوڑ کر چل دئے، جس کی پاداش میں اُن کو مچھلی کے پیٹ میں چلے جانے کا مشہور واقعہ پیش آیا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۔	(اے محمدؐ) اپنے پروردگار کے حکم تک صبر کرو اور مچھلی (کے پیٹ میں جانے) والے کی مانند نہ ہو جائیو۔

نیز فرمایا:

---

[1] سوال نمبر ۵ کا جواب شروع ہُوا۔

[2] حضرت یونسؑ کو اپنی قوم کے خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور ایمان لانے کا غالباً علم نہ تھا۔

پس اُسے مچھلی نے نگل لیا اور وہ سخت شرمندہ اور نادم ہُوا	فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ۔ (۳۷ : ۱۴۲)

اس سے تم سمجھ گئے ہوگے کہ اس قصور کا باعث خواہش نفس تھی۔ یعنی وہ نہیں چاہتے تھے کہ جھوٹے ثابت ہوں اور قوم کے سامنے اُن کی سُبکی ہو۔ جس گناہ کی بناء خواہش نفسانی کے اتباع پر ہو، اس میں ایک گونہ شرک پایا جاتا ہے۔[1] اس لئے سب سے پہلے (یونسؑ کو) توحیدِ الوہیت کا اعتراف کرنا ضروری تھا۔ اس لئے اُنہیں لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنتَ کہنے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا اور خواہش نفس کے بُت کو پاش پاش کر دیا اور وَھُوَ مُلِيْم کی ملامت کو اس اعترافِ حقیقت کے پانی سے دھو ڈالا اور پھر عرضِ حال بیان کیا۔

برخلاف اس کے آدم علیہ السلام کا قصور اُن کی بے احتیاطی تھی، جس کا نتیجہ غلط فہمی اور اس کے بعد ارتکاب جُرم ہُوا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شیطان نے اُن کے سامنے قسمیں کھائیں اور اپنی خیر خواہی کا یقین دلایا۔ چنانچہ آدم علیہ السلام اس کی دشمنی کو بھول گئے (یہی بے احتیاطی تھی) اور جو کچھ شیطان کہتا چلا گیا، آپ نے اُس کو سچ مان لیا اور اس لئے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ جس بات سے منع کیا گیا ہے، اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ بات اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہے۔ شیطان نے اُن کو یقین دلایا تھا کہ انہوں نے شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھا لیا تو وہ فرشتے بن جائیںگے (جن کا مقام اور رُتبہ نوعِ انسانی کے مقام سے بالاتر ہے)۔ اِس لئے آدم علیہ السلام نے بزعمِ خود اپنے لئے ترقیِ مدارج حاصل کرنا چاہا تھا، اور یہ فعل ہوائے نفس کے اتباع پہ مبنی نہیں تھا، لہٰذا توحیدِ الوہیت کے اعتراف کی تجدید چنداں ضروری نہیں تھی۔ ضروری بات

---

[1] ایک حدیث میں ہے کہ ماتحت ادیم السماء الٰہ یعبد اعظم عند ہ من ھوی متبع (ترجمہ: آسمان کے نیچے سب سے بڑا بُت، جس کی پرستش کی جاتی ہے، وہ نفس کی خواہش ہے۔ جس کو عربی میں "ہوائے نفس" کہتے ہیں)۔

یہ تھی کہ وہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتے۔ چنانچہ فوراً بول اُٹھے : رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ۔

خدا کا سچا بندہ اور حقیقی مومن

جو حالت یونس علیہ السلام کو پیش آئی اور اُن سے قصور اور گناہ سرزد ہونے کا باعث ہوئی، ایسی حالت جس شخص کو بھی پیش آئے، اس کے دل میں فی الجملہ تقدیرِ ایزدی سبحانہٗ و تعالیٰ کے خلاف کچھ اعتراض سا پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا ؟ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی حکمت کے متعلق کسی نہ کسی شکل میں شبہات ظہور میں آتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی اپنی فاسد رائے اور غلط خواہش نفس کی اپنے سے نفی کرے اور اس بات کا علم الیقین پیدا کرے کہ سچی حکمت اور صحیح طور پر رحمت اور عدل کا ظہور وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظہور میں آئے۔ انسان کا علم محدود ہے اور اس کی سچی حکمتوں کا کامل ادراک نہیں کرسکتا اور اس کی رحمت اور عدل کے دقائق سمجھنے سے آدمی کی سمجھ قاصر ہے۔ خدائے تعالیٰ کا سچا بندہ اور حقیقی مومن وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام میں اپنی رائے اور اپنی خواہش نفس کو ذرہ بھی دخل نہ دے۔ کلام پاک میں ہے :

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔

(۴ : ۶۵)

(اے محمدؐ) آپؐ کے رب کی قسم! وہ کبھی مومن نہیں ہوں گے، جب تک وہ آپس کے ہر ایک جھگڑے میں آپؐ ہی کو حاکم نہ بنائیں اور پھر جو کچھ بھی آپؐ فیصلہ دے دیں، اس کے متعلق اُن کے دلوں میں ذرہ بھی تنگی نمایاں نہ ہو اور وہ اس کو پُوری طرح تسلیم کرلیں۔

ایمان اور عاشقانِ رسولؐ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ابو حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ :

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا

اُس خدا کی قسم، جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی شخص بھی اپنے آپ کو مومن خیال نہ کرے، جب تک

لِمَا جِئْتُ بِہٖ ۔ | وہ اپنی خواہش نفس کو میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ کردے

حضرت عمرؓ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ :

یا رسول اللہ! واللہ لانت احب الیّ من نفسی ۔ | اے رسولِ خدا! اللہ کی قسم! آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں ۔

اُن کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین | تم میں سے کوئی شخص بھی اپنے آپ کو مومن خیال نہ کرے جب تک کہ وہ مجھے اپنے بیٹے، باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ شمار کرے ۔

کلامِ مجید میں ایک اور مقام پر زیادہ تفصیل کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے :

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۣ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۔

(۹ : ۲۴)

کہہ دو، اگر تمہارے باپ اور تمہاری عزیز اولاد اور تمہارے بھائی (جن کو تم اپنا دست و بازو سمجھتے ہو) اور تمہاری بیویاں اور تمہارا قبیلہ (جس پر تمہاری طاقت کا دارومدار ہے) اور وہ دولت جو تم نے کمائی اور وہ تجارت جس کے سرد پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہے اور اپنی پسندیدہ جگہیں تمہارے نزدیک اللہ اور اُس کے رسول (اُن کی اطاعت) اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑائی کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزولِ عذاب کے منتظر رہو ۔

اِس آیت میں وہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے ایک ایک کرکے گن دی ہیں جو انسان کے لئے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کی اطاعت میں مزاحم ہوتی ہیں ۔ اور بتا دیا کہ اگر ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی محبت پر اثر کر آدمی اللہ تعالیٰ کے احکام سے بے اعتنائی برتتے تو اُس کا انجام یقیناً ہلاکت اور عذاب ہے ۔ جس کے لئے اُسے منتظر رہنا چاہئے ۔

محبتِ الٰہی کا جذبہ

پس جب ایمان کا مقابلہ اس قدر نازک ہے کہ ایمان اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک آدمی اپنے کاروبار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حکم اور منصف نہ بنائے اور پھر آپؐ کے ہر فیصلہ پر سرِ تسلیم خم نہ کر دے۔ ہر خواہش رسول اللہؐ کی اور وہ شریعت کے تابع ہو، رسول اللہؐ کی محبت اور جہاد فی سبیل اللہ کا ولولہ، انسان کو اپنی جان کی محبت، اپنے مال کی محبت، اور اپنے اہل و عیال کی محبت سے مقدم رکھنا مطلوب و مقصود ہے، تو پھر اللہ عزّوجل کی محبت اور اُس کے حکموں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا کیا ٹھکانا؟

اظہارِ کراہیت و ناپسندیدگی

پس جو شخص یہ دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرے کہ لوگ اُس کے خیال میں اللہ کے عذاب کے مستحق ہو رہے ہیں، اور اللہ غفور و رحیم ہے اور اُنہیں معاف کر دیگا اور اُن پر رحم کریگا، اگرچہ اُن کے اعمال ناپسندیدہ ہوں۔ تو یہ بات دو حال سے خالی نہیں۔ یا وہ ارادۃً احکامِ الٰہی کی مخالفت ہوگی، یا گمان ہوگا کہ علمِ الٰہی کی مخالفت ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔ جب تم بھی اس حقیقت سے آشنا ہو جاؤگے تو کراہیت و ناپسندیدگی باقی نہ رہیگی۔ یہی ہم کو حکم دیا گیا ہے اور اسی لئے ہم کو پیدا کیا۔ ہم کو یہ ہرگز حکم نہیں دیا گیا کہ ہم اسے مکروہ جانیں اور اس پر غضبناک ہوں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تو اُسے محبوب رکھتا ہے۔ کیونکہ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ۔ (اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔ پس اس قسم کی کراہیت الوہیتِ الٰہی کی کراہیت ہوگی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسا شخص توحیدِ الوہیت کی تجدید کرے اور لا الٰہ الا اللہ کے ذریعے اپنے اس عقیدۂ باطل کو محو کرلے۔ ہاں کفر و فسق، عصیان و طغیان کی کراہیت سے ہمیں منع نہیں کیا گیا۔

الغرض، ہم پر فرض ہے کہ ہم اپنی پسندیدگی اور عدم پسندیدگی کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور سخط کے تابع بنائیں۔ جس بات کو وہ پسند کرتا ہے، اُس کو ہم بھی پسند کریں، اور جو بات اُس کو ناپسند ہے، اُس کو ہم بھی مکروہ اور ناپسندیدہ سمجھیں، اور اُس کے امر و نہی کا اتباع کریں اور اپنی رائے سے کسی چیز کو پسندیدہ یا ناپسندیدہ نہ خیال کریں۔

باب ۶

عصمتِ انبیاء علیہم السّلام

فصل ۱

مقصدِ تبلیغ رسالت

علماءِ اُمّت اور حفاظتِ الٰہی

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عصمتِ انبیاء علیہم السّلام کے متعلق مذہب سلف کی تحقیق کی جائے۔ تبلیغ رسالت اور احکام کو پہنچانے میں، جن کے پہنچانے کے لئے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں، بلاکم و کاست پہنچا دیتے ہیں اور کبھی کوتاہی اور غلطی نہیں کرتے۔ علماء اُمتِ محمدی کا اس پر اتفاق ہے کہ اس بارے میں وہ بالکل معصوم ہیں۔ اور اسی لئے ضروری ہے کہ جو کچھ اُن کے ذریعے پہنچا ہے، اُسے تسلیم کرنے اور ماننے میں کوتاہی نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُوْلُوْٓا: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ، لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ، وَاِنْ

(اے نبیؐ) کہہ دو، ایمان لائے ہم اللہ پر اور اُس چیز پر جو میری طرف نازل ہوئی اور جو حضرت ابراہیم، اسمٰعیل اسحاق، یعقوب اور اُن کی اولاد (علیہم السّلام) پر نازل ہوئی، اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو اُن کے رب کی طرف سے عطا دیا گیا۔ ہم کسی نبی میں فرق نہیں جانتے بلکہ سب کو تسلیم کرتے ہیں۔ پس (اے نبی!) اگر وہ لوگ تمہاری طرح ایمان لے آئیں تو بیشک ہدایت پا جائیں گے

تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ، فَسَیَکْفِیْکَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ (۲: ۱۳۶، ۱۳۷)

اور اگر اعراض کریں تو سمجھ لو کہ وہ شقی ہیں۔ پس تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہے اور وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

اور فرمایا:

وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ، (۲: ۱۷۷)

اور لیکن نجات اس کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آیا اور آخرت پر اور اس کی کتابوں اور نبیوں کو تسلیم کرلیا۔

اور فرمایا:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ، کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ، لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ، وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ۔ (۲: ۲۸۵)

رسول تو اس پر ایمان لے آیا جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوا اور مومن بھی ایمان لے آئے۔ سب نے اللہ اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے نبیوں کو مان لیا ہم نے تو کسی نبی میں فرق نہیں ڈالا، اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور قبول کرلیا۔ اے پروردگار تیری طرف ہی ہم نے لوٹنا ہے۔

برخلاف اس کے نبیوں کے بغیر کوئی شخص معصوم نہیں، اگرچہ وہ اولیاء اللہ ہی میں سے کیوں نہ ہو۔ اسی بناء پر جملہ فقہا کے نزدیک نبی کو گالی دینے والے کا قتل کردینا واجب ہے اور غیر نبی کو گالی دینے والا ہرگز قتل نہ کیا جائے:

من سبّ نبیًّا من الانبیاءِ قتل ومن سبّ غیرھم لم یقتل۔

جس نے نبیوں میں سے کسی نبی کو گالی دی، وہ قتل کیا جائیگا۔ اور جس نے نبیوں کے سوا کسی کو گالی دی، وہ قتل نہ کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو معصوم اور محفوظ رکھنے کا خود ذمّہ اُٹھایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ

(۷۲ : ۲۸)

وہی غیب[1] کی باتیں جانتا ہے اور اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، البتہ (لوگوں کو ایسی باتوں سے مطلع کرنے کیلئے) وہ کسی کو اپنا رسول چن لیتا ہے اور پھر اُس کے آگے پیچھے (فرشتوں کا) پہرہ لگا دیتا ہے[2] جب تک کہ وہ جان لے کہ رسولوں نے خدائے تعالیٰ کے پیغام (محفوظ طور پر بلا کم و کاست) پہنچا دئے۔

اِس قسم کی عصمت انبیاء علیہم السّلام کے لئے ضروری ہے اور اسی کی بدولت نبوّت اور رسالت کا مقصود حاصل ہوتا ہے۔ نبی کا لفظ نبأ بمعنی خبر سے مشتق ہے اور اس کے معنے ہیں "اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبریں دینے والا"۔ اسی طرح رسالت کے معنی پیغام کے ہیں۔ رسول بمعنی "اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچانے والا"۔ اس لئے یہ لازم ہے کہ ہر ایک نبی اور ہر ایک رسول تبلیغ و ترسیلِ احکامِ الٰہی میں معصوم ہو۔ بصورتِ دیگر اللہ تعالےٰ کا پیغام ناقص ہوگا، جو ناممکن ہے۔ تمام مسلمانوں کا اِس پر اتفاق ہے۔

اختلافِ علماء اور القاءِ شیطانی

البتہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا نبی اور رسول کی زبان پر تلاوت کی اثناء میں کوئی ایسا کلمہ جاری ہوسکتا ہے جو شیطان کا القاء ہو، اور جس کو بعد میں بذریعہ وحی باطل ٹھہرایا جائے۔ اس کے متعلق دو قول ہیں: ایک تو اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور سلف کا بھی یہی مذہب ہے۔ قرآن و حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ کلامِ مجید میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے:

---

[1] غیب کا لفظ اپنے وسیع ترمعنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جنّت اور دوزخ کا حال بتانا اور اعمال میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی یا عدمِ خوشنودی کا پتہ دینا سب اس کے مفہوم میں داخل ہے۔

[2] تاکہ اس کی تبلیغ شیطان اور قوّتِ واہمہ وغیرہ کے تصرّف سے بالکل محفوظ رہے

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۔ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ، وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ، وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔

(۲۲ : ۵۲ ، ۵۳)

(اے نبیؐ) ہم نے آپؐ سے پہلے کوئی ایسا رسول یا نبی نہیں بھیجا، جس کو یہ مرحلہ پیش نہ آیا ہو کہ جونہی انہوں نے کوئی آرزو کی، تو شیطان نے اُن کی آرزو میں کوئی نہ کوئی فتنہ ڈال دیا جس کے بعد اللہ نے شیطان کی وسوسہ اندازی کو مٹا دیا، اور اپنی نشانیوں کو مضبوط کر دیا، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اس میں یہ مصلحت رہی ہے کہ شیطان کی وسوسہ اندازی اُن لوگوں کی آزمائش کا ذریعہ ہو جائے جن کے دل روگی اور سخت ہو گئے ہیں۔ بلاشبہ یہ ظالم بڑی ہی گہری مخالفت میں پڑے ہیں۔ نیز یہ مصلحت بھی تھی کہ علم والے اس بات کو جان لیں کہ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اس طرح یہ ایمان لے آئیں اور ان کے دل میں عجز و نیاز پیدا ہو جائے یقیناً اللہ ایمان والوں کو کامرانی کی سیدھی راہ پر چلانے والا ہے۔

اہلِ حدیث کا عقیدہ

ان آیات کے شانِ نزول میں یہاں جو قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سورۂ نجم کو تلاوت کرنے اور اثنا تلاوت میں شیطان کے بعض الفاظ کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر جاری کر دینے کا منقول ہے وہ ایک معروف روایت ہے اور کتبِ تفسیر و حدیث میں اس کو تسلیم کیا گیا ہے۔ متنِ آیت میں بھی اس بات کا اشارہ موجود ہے۔ کیونکہ شیطانی القاء کو مٹانا اور آیتوں کو قائم رکھنا ہی یہ ظاہر کر رہا ہے کہ آیاتِ الٰہی کے نزول کے دوران میں فی الواقعہ کچھ ایسا اختلاط پیش

آیا ہے اور آنا ممکن ہے، جس کے رفع کرنے اور حق و باطل میں تمیز کر دینے کو نسخ اور احکام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اہلِ حدیث علماء کا یہی قول ہے۔

لیکن جو لوگ متاخرین میں سے اس کے خلاف ہیں، وہ پہلے گروہ پر یہ طعن کرتے ہیں اور انکار کرتے ہیں کہ سورۂ نجم میں یہ الفاظ داخل کئے جائیں:

تلك الغرانیق العلی و ان شفاعتها لترتجی۔	یہ بزرگ ہستیاں بلند مرتبہ ہیں (لات و عزیٰ وغیرہ بت) ان کی شفاعت کی بھی امید کی جاتی ہے۔

کیونکہ یہ الفاظ ہرگز ثابت نہیں ہیں، اور جس نے ثابت جانا، اُس نے تسلیم کیا کہ القاء شیطانی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر ایسے الفاظ ہرگز جاری نہیں ہو سکتے۔ اور اپنی تائید میں یہ آیت قرآنی پیش کی: اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (تمام رسولوں کو یہ مرحلہ پیش آیا کہ اُن کی آرزوؤں میں شیطان نے فتنہ ڈال دیا)۔

صداقتِ نبوّت کی مستحکم دلیل

فریقِ مخالف نے جو اعتراض اِس القاء پر کئے ہیں، وہ بعینہٖ مسئلہ نسخ آیات پر وارد ہوتے ہیں لیکن ہم کہتے ہیں کہ اس قسم کا نسخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صادق فی الرسالۃ ہونے کی ایک زبردست دلیل ہے اور یہ کہ وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے۔ کیونکہ کسی ایک بات کا حکم دے کر جب وہ بعد میں اُس کو منسوخ بتاتے ہیں تو اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ بلکہ وہ مامور بندے ہیں، اور جو کچھ حکم ملتا اُسی کی تبلیغ فرماتے ہیں۔

حضرت عائشہ رض کا قول

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ "اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی کا ایک حرف بھی چھپانا چاہتے تو سب سے پہلے اس آیت کی تبلیغ میں کوتاہی فرماتے کہ:

وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ	اور تم اپنے دل میں ایک ایسی بات چھپانا چاہتے تھے جس کو

وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ۔ (۳۳ : ۳۷)

اللہ تعالیٰ طشت از بام کرنے کا اہل تھا اور اس کے اظہار میں تم لوگوں سے ڈرتے تھے، حالانکہ خدا سے ڈرنا زیادہ ضروری ہے۔

سچے اور جھوٹے کی پہچان

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص جھوٹا ہو اور اپنی نمود کا خواہاں ہو، وہ ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ آج ایک بات کہہ کر کل اس کی تردید کرے۔ بلکہ جو کچھ اس کے منہ سے نکل جائے، وہ اس کی تائید اور اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کرتا ہے۔ برخلاف اس کے جو سچا نبی اور سچا رسول ہے، وہ اپنی خواہش نفس کا تابع نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا تابع فرمان ہوتا ہے اور جو کچھ اس کو حکم ملتا ہے وہی لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ لوگوں کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع ملے، یا لوگ اس نسخ کو اس کے تناقض پر محمول کریں، جس میں اس کی خفت متصور ہو۔ پس رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ایک بات کو بغیر خفت محسوس کئے صاف صاف بیان کر دینا، اس بات کی محکم دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حکموں کو ثابت کر دیا اور جو القاء شیطانی تھا اسے باطل قرار دے دیا ہے، اور یہ آپؐ کی صداقت کی بیّن دلیل ہے اور جھوٹا نبی ہونے سے بریت ہے، اور یہی رسالت کی غرض و غایت ہے۔ آپؐ صادق المصدوق ہیں اور آپؐ کی رسالت کو جھٹلانا اسی لئے صریح کفر ہے۔

فصل ۲

انبیاء اور تبلیغ رسالت کے علاوہ کام

جمہور علماء کا قول

لیکن جن باتوں کا تعلق تبلیغ رسالت سے نہیں ہے، ان میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی عصمت میں بڑا اختلاف ہے کہ آیا ان کی عصمت از روئے عقل ثابت ہے یا خلاف قیاس؟ پھر یہ جھگڑا ہے کہ کیا کبائر سے معصوم ہیں یا صغائر سے؟

کفر سے پاک ہیں یا قبل از بعثت گناہوں سے؟ وغیرہ وغیرہ! لیکن جمہور علماء کا صحیح تر قول وہ ہے جس کی بنا پر سلف کے اقوال منقولہ پر یہ بات صادق آتی ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے (اُن کے رُتبہ کے موافق) گناہ صادر ہو جاتے ہیں، لیکن وہ اُن پر مُصر نہیں رہتے۔

استدلالِ معصومیتِ مطلقہ

بعض علماء جو اُن کو معصوم مطلق سمجھتے ہیں، اُن کی دلیل یہ ہے کہ "انبیاء علیہم السّلام کی اقتدا یعنی اُن کے افعال کی پیروی کرنا اُمت پر لازم ہے، اس لئے اگر اُن سے گناہ کا صادر ہونا ممکن ہو تو اقتدا میں خلل آتا ہے"۔ پس نبی معصوم ہوتا ہے، اُس سے کوئی گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا۔

لیکن یہ بھی ایک مسلّمہ امر ہے کہ اُن کا اقتدا اُن افعال میں کیا جاتا ہے، جن پر وہ قائم رہے اور جن سے انہوں نے رجوع نہیں کیا۔ چنانچہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام کے امر اور نہی کا اتباع کرنا بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر یا نہی بعد میں منسوخ نہ ہو گئی ہو۔

منافیِ کمال اور فضیلتِ توبہ

مطلق عصمت کے قائلین کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ "گناہ کا صادر ہونا کمال کے منافی ہے[1]، اور یہ اُن کا ارتکابِ ذُنوب لوگوں کے لئے نفرت کا موجب ہوگا، اور اس لئے رسالت کا مقصود کما حقہٗ پُورا نہیں ہوگا"۔ لیکن یہ دلائل بھی اُس حالت میں مؤثر ہو سکتے ہیں جبکہ یہ کہا جائے کہ وہ گناہ پر مُصر رہتے ہیں، لیکن اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے ابھی جمہور علماء کا قول نقل کیا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ "گناہ اُن سے صادر ہوتے ہیں لیکن وہ اُن پر مُصر نہیں رہتے"۔ فوراً تائب ہو کر خُدا کے حضور طالبِ معافی ہوتے ہیں۔

اور تم جانتے ہو کہ وہ سچی توبہ جس کو بارگاہِ کبریا میں شرفِ قبولیت حاصل ہو جائے، اس کے بعد انسان اپنی قبل از توبہ حالت کے مقابلے میں بلند تر درجہ پر فائز ہوتا ہے چنانچہ بعض سلف سے منقول ہے کہ "توبہ کے بعد کے داؤد علیہ السّلام قبل از توبہ والے

---

[1] اور یہ مانا گیا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام بنی نوعِ انسان کے کامل ترین افراد ہیں۔

داؤد سے افضل تھے"۔ کلام مجید میں ہے :

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (۲ : ۲۲۲)	بیشک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۔

دوسری جگہ پر ارشاد ہے :

اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۔ (۲۵ : ۷۰)	لیکن جس شخص نے توبہ کی اور ایمان لاکر نیک اعمال کئے، اُن لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں میں تبدیل کر دے گا ۔

صحیح حدیث میں بیان ہے کہ قیامت کے دن ایک آدمی کے صغائر خدا کے سامنے پیش کئے جائیں گے اور اُس کے کبائر چھپا دئے جائیں گے۔ کیونکہ وہ کبائر کو ظاہر کرنے سے بچتا تھا۔ پس اللہ سبحانہٗ فرمائیں گے : میں نے تیرے گناہ معاف کر دئے اور تیرے ہر ایک گناہ کو نیکی سے بدل ڈالا "۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کی معافی کی حالت پہلی حالت سے یقیناً بہتر ہو گی ۔

مرضِ خود بینی کی سزا

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے سلف صالحین کا قول ہے کہ :

ان العبد ليعمل الحسنة فيدخل بها النار، وان العبد ليعمل السيئة فيدخل بها الجنة ۔	بعض اوقات انسان نیکی کرتا ہے اور دوزخ میں جاتا ہے اور کبھی برائی کرتا ہے تو جنت میں داخل ہوتا ہے ۔

پھر انہوں نے اپنے اس قول کی تشریح اس طرح پر کی ہے کہ : آدمی نیکی کر کے اُس پر نازاں ہوتا ہے اور خود بین بن جاتا ہے ۔ اس کا انجام دوزخ ہے ۔ برخلاف اس کے برائی کر کے آدمی کے دل میں خدائے تعالیٰ کا خوف پیدا ہوتا ہے، وہ اُس کی طرف رجوع کرتا اور تائب ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اُس کو جنت میں داخل

فرماتا ہے[1]، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا. لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۔ (۳۳: ۷۳)

اور منظور کرلیا انسان نے اس (بارِ امانت) کو، بیشک وہ ظالم اور جاہل ہے۔ عذاب میں مبتلا کریگا اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو اور پھر آئیگا اللہ تعالیٰ مومن مردوں اور مومن عورتوں کی طرف اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

الغرض، قرآن، حدیث اور دیگر کتب سماویہ تمام اس قول کی مؤید ہیں اور کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔

---

[1] صحیح حدیثوں سے حرف بحرف اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ من جملہ اس کے بنی اسرائیل کے ایک بڑے عابد کا ایک خطا کار کے متعلق یہ کہنا کہ "خدا کی قسم! یہ نہیں بخشا جائیگا" تو اس خود بینی سے اس کی تمام نیکیاں برباد ہوگئیں اور وہ دوزخ میں ٹھونس دیا گیا۔ اسی طرح بنی اسرائیل میں سے ایک دوسرے شخص کا قصہ ہے کہ اُس نے اپنی تمام عمر میں ایک بھی نیکی نہیں کی تھی، لیکن مرتے وقت اُس کے دل میں خُدا کا خوف پیدا ہُوا اور اُس نے اپنی نعش کو جلا دینے اور اُس کے بعد اُس کی خاکستر کو ہوا میں اُڑا دینے کی وصیت کی، جس پر خدائے تعالیٰ نے اُس کو بخش کر جنت میں داخل کر دیا۔ یہ دونوں قصّے صحیحین میں مذکور ہیں اور سعید بن جبیرؓ کے قول میں جس اُصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اُس کے لئے بمنزلہ شاہدِ عدل کے ہیں۔

(مترجم)

فصل ۳

انحراف مسلّمہ اصول اور فقدانِ ایمان

انبیاء کا قصور اور دُور از کار تاویلیں پھر اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں متعدد آیتوں میں حضرت خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام من اللہ الاکبر کو وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ "کہہ کر مخاطب فرمایا ہے" اور قرآن اور حدیث میں اس بات کی تصریحات موجود ہیں کہ پیغمبروں سے گناہ اور قصور[1] سرزد ہوا، جس پر وہ نادم ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے مغفرت طلب کی۔ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے لیکن ایک دوسرا فریق ان نصوص کی ایسی ہی دُور از کار تاویلیں کرتا ہے جو اُن قرامطہ اور جہمیہ اور باطنیہ کی تاویلات کے مشابہ ہوتی ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ علیا کے حقائق کی ایسی ہی تاویلیں کر کے انکار کیا ہے یہ لوگ بزعم خود انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعظیم کرنا چاہتے ہیں، جس میں اپنی رائے کو استعمال کر کے دانستہ یا نادانستہ اُن کی تکذیب میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔

حصولِ سعادت کا حکمی نسخہ علاوہ ازیں وہ لوگ جس قسم کی عصمت کا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لئے دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر وہ ثابت بھی ہو، تو اس سے اُن کی اپنی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی ان کو اس عصمت کے ثابت کرنے کی کچھ زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق خود اُن کی ذات سے نہیں اور نہ اس کی بابت کوئی خاص حکم موجود ہے[2]۔ قیامت کے دن انسان سے اُس کے اپنے اعمال کے متعلق پوچھا جائیگا۔ جیسا کہ فرمایا:

---

[1] لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کے علوّ مرتبت کے لحاظ سے یہ گناہ اور قصور تھا۔ مگر حسنات الابرار سیئات المقربین کے زرّیں اصول کو ہرگز نہ بھولنا چاہیئے۔

[2] یعنی اس پر ایمان لانا جزوِ ایمان نہیں ہے۔

وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ (۱۶ : ۹۳)	بے شک تم قیامت کے دن ضرور اُن اعمال کے متعلق پوچھے جاؤ گے جو تم کیا کرتے تھے ۔

یہ لوگ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذات کے متعلق اکثر بغیر کسی دلیل شرعی کے بحثیں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جو اُن کا اصلی فرض ہے یعنی انبیاء علیہم السلام پر سچے دل سے ایمان لانا اور اُن کی تعلیم پر عمل پیرا ہونا، جو حصولِ سعادت کا حکمی اور تیر بہدف نسخہ ہے، اُس کی پروا نہیں کرتے ۔ کلامِ مجید میں ہے :

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۗ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۗ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۔ (۲۴ : ۵۴)	کہہ دو "اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اُس کے رسول کا حکم مانو۔ لیکن اگر تم نے رُوگردانی کی تو سمجھ لو کہ بیشک پیغمبر پر اپنی ذمہ داری ہے اور تم پر تمہاری ذمہ داری ۔ ہاں اگر تم اُس کی اطاعت کرو گے تو سیدھا راستہ پاؤ گے ۔ رسول پر تو یہی ذمہ داری ہے کہ وہ کھلے طور پر اللہ تعالیٰ کا پیغام تم کو پہنچا دے ۔

قصورِ انبیاء اور توبہ

الغرض قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر کے گناہ اور قصور کا ذکر فرمایا ہے، ساتھ ہی اُس کی توبہ و استغفار کا بھی ذکر ہے ۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تو یہ دُعا مشہور ہی ہے کہ :

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ (۷ : ۲۳)	اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا، تو بیشک ہم بہت ہی خسارہ پانے والوں میں سے ہوں گے ۔

حضرت نوح علیہ السلام کا یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد کہ انہوں نے اپنے کافر بیٹے کی نجات کے لئے سوال کیا، جو ایک غلطی تھی، اُن کی یہ دُعاء نقل کی گئی ہے :

رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ	اے میرے پروردگار! میں تیری پناہ میں آتا ہوں کہ تجھ سے

مَا لَيْسَ لِي بِهٖ عِلْمٌ، وَاِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِيْ اَكُنْ مِّنَ الْخَاسِرِيْنَ۔ (۱۱ : ۴۷)	ایسی بات کا سوال کیا، جس کا مجھے کچھ بھی علم نہیں۔ اور اب اگر تو مجھے نہ بخشیگا اور مجھ پر رحم نہیں فرمائے گا تو میں زیاں کاروں میں سے ہوجاؤں گا۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی یہ دُعا، ملاحظہ ہو :۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ۔ (۱۴ : ۴۱)	پروردگارا! جس دن حساب کتاب قائم ہو مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے اور مومنین کو بھی مغفرت فرما۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ منقول ہے :

اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ، وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ۔ (۷ : ۱۵۵، ۱۵۶)	خُدایا! تو ہمارا کارساز ہے، تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو ہی سب بخشنے والوں سے افضل ہے اور اس دُنیا میں ہمارے لئے نیکی مقرر کردے اور آخرت میں ہمیں اپنی طرف ہدایت یاب فرما۔

پھر فرمایا :

رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ (۲۸ : ۱۶)	پروردگارا! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، تو مجھے بخش دے۔

کوہِ طور پر تجلیٔ الٰہی کی تاب نہ لاسکے اور بیہوش ہوکر گر پڑے، تو جب ہوش میں آئے تو عرض کی:

فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۷ : ۱۴۳)	جب موسیٰ ہوش میں آئے تو بولے، خدایا! تیرے ہی لئے ہر طرح کی تقدیس ہے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں یقین رکھنے والوں میں پہلا شخص ہوں۔

داؤد علیہ السلام کے حق میں ہے۔

فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ، فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا	اُس نے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کی اور جھک کر رکوع کیا، اس کے بعد خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔

لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۔ (۳۸ : ۲۴)	پس ہم نے اُسے بخش دیا اور ہمارے نزدیک اُس کے تقرب کی جگہ ہے اور بہتر جائے پناہ ۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی خطا کا ذکر کرنے کے بعد آپ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ :

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۔ (۳۸ : ۳۵)	اے میرے پروردگار! مجھے بخش دے اور مجھ کو ایک ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی دوسرے کے لئے سزاوار نہ ہو۔ بیشک تو ہی بڑا عطا کرنے والا ہے ۔

حضرت یونس علیہ السلام کی دُعا تمہارے سامنے ہے کہ :

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (۲۱:۸۷)	تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تیری ذات پاک و مقدس ہے اور بیشک میں ظالموں میں سے ہوں ۔

فصل ۴

حضرت یوسف علیہ السلام

هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا البتہ حضرت یوسف علیہ السلام کی بابت کسی گناہ کے ارتکاب کا ذکر نہیں فرمایا، اور اس لئے اُن کا استغفار بھی منقول نہیں بلکہ اُن کی عصمت کی کیفیت اِن الفاظ میں بیان فرمائی ہے :

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۔ (۱۲ : ۲۴)	ہم نے ایسے ہی اسباب مہیا کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بُرائی اور بے حیائی کو اُس سے دُور رکھیں، کیونکہ اس میں شک نہیں کہ وہ ہمارے چُنے ہوئے بندوں میں سے تھا ۔

اِس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے کسی قسم کی برائی اور بےحیائی صادر نہیں ہوئی رہا یہ کہ اس سے پہلے آیا ہے :

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۔ (۱۲ : ۲۴)

بیشک اس عورت نے یوسفؑ کو قابو میں لانے کا قصد کیا اور اُس نے بھی قصد کیا ہی تو تھا، اگر وہ رب کی طرف سے ایک روشن دلیل نہ دیکھ لیتا (تو کام خراب تھا)

حضرت امام احمد بن حنبل کا قول

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اَلْھَمّ ھَمَّانِ، ھَمّ خَطَرَاتٌ وَھَمّ اِصْرَارٌ" (قصد کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ کوئی بات خطرہ کے طور پر دل میں گزر جائے۔ دوسرے یہ کہ کسی فعل کے کرنے کا ارادہ کرلے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث ہے کہ:

ان العبد اذا ھم بسیئۃ لم یکتب علیه واذا ترکھا للہ کتبت له حسنۃ وان عملھا کتبت له سیئۃ واحدۃ وان ترکھا من غیر ان ترکھا للہ لم تکتب له حسنۃ ولا تکتب علیه سیئۃ ۔

جب آدمی کسی بُرائی کا صرف قصد کرتا ہے تو وہ لکھی نہیں جاتی (جب تک اُس کا ارتکاب نہ کرے) اور اگر اس کا عمل میں لانا خالص اللہ کے لئے ترک کردے تو اُس کے لئے نیکی لکھی جاتی ہے۔ اگر برائی کا ارتکاب ہو جائے تو ایک ہی بُرائی لکھی جاتی ہے (نیکی کی طرح دس گنا نہیں لکھی جاتی) اور اگر اس قصد کو عمل میں نہ لائے اور بُرائی کا ارتکاب نہ کرے، لیکن اُس کا یہ ترک کرنا اللہ (اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے) کے لئے نہ ہو تو نیکی یا بُرائی کچھ بھی نہیں لکھی جاتی۔

قصد اور ترک یوسفؑ

حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک قصد کیا، لیکن اس کا عمل میں لانا خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ترک کردیا۔ اس خلوص کی بدولت اللہ تعالیٰ نے آپ کو برائی اور بے حیائی سے محفوظ رکھا، جیسے کہ آیہ مذکورۂ بالا میں اس کی تصریح ہے۔ حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کے دل میں بمقتضائے بشریت گناہ کرنے کا خیال سا پیدا ہوا۔ اُس نے اس خیال کو رد کیا اور خالص اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے آپ کو بُرائی کے ارتکاب سے روکا۔ اس لئے اُن کا یہ رُک جانا ایک نیکی ہے، جیسے کہ مندرجہ بالا

حدیث صحیح سے واضح ہوتا ہے۔

ایک غلط روایت لیکن بعض روایات میں جو یہ منقول ہے کہ:

انہ حل سراویلہ وجلس مجلس الرجل من المرأۃ وانہ رأی صورۃ یعقوب عارضاً علی یدہ وامثال ذالک۔

حضرت یوسفؑ نے سراویل کا بند کھولا اور فعلِ بد کے ارتکاب کی نیت سے بیٹھ گئے۔ اس حالت میں آپ کو حضرت یعقوبؑ کی صورت نظر آئی جو اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ رہے تھے، یا ایسی اور روایتیں۔

اِس قسم کی خرافات کا قرآن اور حدیث میں کچھ ذکر نہیں اور نہ ہی اللہ اور اُس کے رسولؐ نے ایسی باتوں کی خبر دی ہے۔ یہ سب روایتیں یہودیوں سے لی گئی ہیں جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حق میں سب سے زیادہ جھوٹ بولتے ہیں اور ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جو سراسر اُن کی شان اور اُن کے علوِّ مرتبت کے منافی ہوتی ہیں۔

مفسرین کی غلطی پس اسی قسم کا ایک قول یہ بھی ہے جو مسلمانوں نے اہلِ یہود سے نقل کیا ہے اور ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں ایک حرف بھی نہیں آیا کہ یہ قول حضرت یوسف علیہ السلام کا ہے: وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (ــــ) یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ہرگز نہیں، جیسے کہ عام طور پر سمجھا گیا ہے، بلکہ یہ عزیز کی بیوی کا مقولہ ہے۔ اور جس شخص نے اِس آیت کے سیاق وسباق پر غور کیا، اُس کو اس میں ذرہ بھی شک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں، وہاں حضرت یوسف علیہ السلام موجود ہی نہیں تھے، بلکہ وہ قید خانے میں تھے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ

بادشاہ نے کہا: یوسف کو فوراً میرے پاس لاؤ۔ لیکن جب (بادشاہ کا) پیغامبر یوسفؑ کے پاس پہنچا تو اُس نے کہا، تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور دریافت

قَطَّعْنَ اَیْدِیَھُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِھِنَّ عَلِیْمٌ، قَالَ مَا خَطْبُکُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ یُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِہٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰہِ مَا عَلِمْنَا عَلَیْہِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ الْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّہٗ عَنْ نَّفْسِہٖ وَاِنَّہٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ، ذٰلِکَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْہُ بِالْغَیْبِ وَاَنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ، وَمَآ اُبَرِّیُٔ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔(۱۲: ۵۰-۵۴)

کرو، اُن عورتوں کا کیا معاملہ تھا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، جیسی کچھ مکّاریاں انہوں نے کی تھیں میرا پروردگار اُسے خوب جانتا ہے۔ بادشاہ نے اُن عورتوں کو بلا کر پوچھا: صاف صاف بتا دو اُس وقت تمہیں کیا معاملہ پیش آیا تھا جب تم نے یوسُف پر ڈورے ڈالے تھے کہ اُسے اپنی طرف مائل کر لو؟ وہ عورتیں بولیں، حاشا للہ! ہم نے یوسُف میں کوئی بُرائی کی بات نہیں پائی۔ عزیز کی بیوی بھی (یہ سن کر بے اختیار) بول اٹھی: جو حقیقت تھی، وہ اب ظاہر ہو گئی کہ ہاں، وہ میں ہی تھی جس نے یوسُف پر ڈورے ڈالے تھے کہ اپنا دل ہار بیٹھے۔ بلاشبہ وہ بالکل سچا ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہا ہے کہ اُسے (یوسُف کو) معلوم ہو جائے میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کے معاملہ میں خیانت نہیں کی، نیز اس لئے کہ اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی کامیابی کی راہ نہیں کھولتا۔ میں اپنے نفس کے تقدس کا دعویٰ نہیں کرتی۔ ہمارا نفس تو برائی کے لئے بڑا ہی اُبھارنے والا ہے (اس کے غلبہ سے بچنا مشکل ہے) مگر ہاں، اس حال میں کہ میرا پروردگار رحم فرمادے۔ بلاشبہ میرا پروردگار، بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔

جب اُن کی برأت، عورتوں کی شہادت اور خود عزیز کی بیوی کے اعتراف سے ثابت ہوئی تب بادشاہ نے ان کو قید خانے سے نکلوایا اور آپ کی تعظیم و توقیر کی۔

قَالَ الْمَلِکُ ائْتُوْنِیْ بِہٖٓ اَسْتَخْلِصْہُ لِنَفْسِیْ ۚ فَلَمَّا کَلَّمَہٗ قَالَ اِنَّکَ

بادشاہ نے حکم دیا: یوسف کو میرے پاس لاؤ کہ اُسے اپنے خاص کاموں کے لئے مقرر کردوں۔ پھر جب وہ آئے

اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ۔ (۱۲ : ۵۴)

تو بادشاہ نے) اُن سے ملاقات کی تو کہا: آج کے دن سے تو ہماری نگاہوں میں بڑا صاحبِ اقتدار اور امانتدار انسان ہے۔

قرآن کریم کی آیات کا یہ مفہوم بالکل صاف اور واضح ہے۔ اکثر مفسرین کا اس کو یوسف صدیق علیہ السلام کا قول قرار دینا محض بے دلیل اور ایک باطل قول ہے، جیسے کہ کسی دوسرے موقع پر اس کی مزید تشریح کی گئی ہے۔

فصل ۵

بیانِ فضیلت و کمال

رجوع الی اللہ کا نتیجہ

یہاں پر یہ بتانا مقصود تھا کہ حضرت یونس علیہ السلام سے جو گناہ یا قصور سرزد ہُوا، جب اُنہوں نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کے طالب ہوئے تو اُن کا سب کا سب گناہ بخشا گیا۔ قصور نیکیوں میں تبدیل ہوگیا اور رفع درجات کا موجب ہُوا۔ مچھلی کے پیٹ سے نکلنے کے بعد کا یونسؑ رجوع الی اللہ کے باعث بہت عظیم المرتبت یونسؑ بن گئے۔ کلام پاک میں ہے:

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔۔ (۶۸ : ۵۰)

پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو چن لیا (برگزیدہ بنالیا) اور اپنے نیک بندوں میں داخل فرمایا۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ

یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ" (بے شک عملوں کا اعتبار بلحاظ اُن کے خاتمہ کے ہے) ہر ایک شخص کا درجۂ کمال اُس کی آخری حالت کے لحاظ سے تعین کیا جاتا ہے۔ ابتدائے حال کا کچھ لحاظ نہیں کیا جاتا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ انسان کو ابتدائے آفرینش میں جب ماں کے پیٹ سے نکالتا ہے تو وہ

علم اور دیگر کمالات سے بالکل بے بہرہ ہوتا ہے۔ پھر بتدریج اس کو درجۂ کمال تک پہنچاتا ہے۔ اب کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ایک کامل مکمل شخص کو اس کی طفلی کا زمانہ یاد دلائے اور اُس کو جاہل تصور کرے۔ قبل از توبہ اور بعد از توبہ کی بھی بعینہٖ یہی کیفیت ہے۔ اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام اور دیگر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعد از توبہ حالت اکمل احوال انسانی ہے اور ارتکاب خطا و قصور کی حالت کو ملحوظ رکھ کر اُن کو ناقص یا قابلِ ملامت سمجھنا ایک نہایت ہی غلط خیال ہے۔

فصل ۶

ملائکہ کو انبیاءؑ پر فضیلت

غلط فہمی کی وجہ جو لوگ ملائکہ کو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے افضل سمجھتے ہیں، اُن کو بھی یہی غلط فہمی ہوئی ہے کہ انہوں نے اُن کی موجودہ حالت کا ملائکہ کے ساتھ موازنہ کیا۔ اگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اُن درجاتِ عالیہ اور رأس مقام ارجمند کو مدنظر رکھتے جو جنت الفردوس میں داخل ہو کر اُن کو حاصل ہوگا، جبکہ وہ ان تمام نقائص اور عیوب سے مبرا ہونگے جو موجودہ حیاتِ بشریہ کا مقتضاء ہے اور جبکہ ملائکہ علیہم السلام ہر ایک طرف سے سلام کہتے ہوئے اُن کے محلات کے دروازوں سے داخل ہونگے۔ فرمایا:

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ، سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (۱۳ : ۲۳، ۲۴)	اور فرشتے اُن پر ہر ایک دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں، تم پر بسبب صبر کرنے کے سلامتی ہو۔

فضیلتِ کمال باعتبارِ مآل جب اِن حالات کا لحاظ رکھا جائے تو انہیں معلوم ہو کہ کون افضل ہے اور مفضول یہ کون؟ مخلوقات میں سے کمال کسے حاصل

سہے؟ کیا کسی عقلمند نے اس بات کو بھی سوچا ہے کہ کمال حاصل کرنے سے قبل اُن کی اپنی کیا حالت تھی؟ کیا وہ تمام عیوب و نقائص سے پاک تھے۔ کمالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیشہ آخری حالت کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ ابتدائے خلقت میں انبیا علیہم الصلوٰۃ و السلام کی بھی عام انسانوں کی طرح نطفہ اور مضغہ سے آفرینش ہوئی ہے اور اُنھوں نے بھی بچپن کے مراحل طے کئے ہیں۔ اس لئے کمال کے لئے مآل کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اور اسی بناء پر یہ خیال بھی غلط ہے کہ جو شخص مسلمان پیدا ہوا اور عمر بھر میں اُس نے کفر نہیں کیا، وہ مطلقاً اُس شخص سے افضل ہے جو کافر رہ کر مسلمان ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس کی عاقبت اعلیٰ اور افضل ہے، اسی کو اعلیٰ و افضل سمجھا جائے گا۔ خلفائے راشدین اور اکثر مہاجرین اور انصار کے سابقین اوّلین جو اللہ اور اُس کے رسُول پر ایمان لائے، ابتدائے عمر میں کافر تھے اور بعض اُن میں سے (مثلاً حضرت عمرؓ) شدید ترین کفّار میں سے تھے، لیکن آخر عمر میں اُن کو وہ مراتب عالیہ نصیب ہوئے کہ اُن کی اولاد، جن کی پیدائش اسلام پر ہوئی، اُن کے گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔

ابن تیمیہ کا قول

بلکہ میں[1] کہتا ہوں، جس شخص نے ذوق اور وجدان سے شرّ اور معصیت کو پہچانا ہو، اُس کی معرفت اکمل ہے، بمقابلہ اُس شخص کے جس نے شرّ اور معصیت کو صرف نام سے جانا ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص صرف خیر و طاعت کو پہچانتا ہے، بعض اوقات اُس کو ایک ایسا شرّ پیش آجاتا ہے جس کو وہ نہیں جانتا۔ اس لئے یا تو وہ اس میں گر جاتا ہے یا کم از کم وہ اس کی نظروں میں اتنا مبغوض نہیں ہوتا، جتنا کہ اس کو مبغوض سمجھنا چاہیئے۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اِنّما تنقض عری الاسلام عروۃ	جب ایک شخص کی اسلام میں تربیت ہوتی ہے اور وہ جاہلیت

[1] شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

عروۃ اذا نشأ فی الاسلام من لم یعرف الجاہلیۃ ۔ | کو ذوق و وجدان کے ساتھ نہیں پہچانتا ہے تو بیشک اُس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی مضبوط کڑیوں کو یکے بعد دیگرے کھول دیتا ہے ۔

یہ نہایت سچا قول ہے، کیونکہ اسلام کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ ہی سے کمال حاصل ہوتا ہے لیکن جس شخص نے نیکیوں کے ماحول میں تربیت پائی ہے اور منکرات سے اس کو واسطہ نہیں پڑا، اُس کو منکرات کی کیفیت اور حقیقت کا کما ینبغی علم بھی نہیں ہوتا ۔ اور نہ اس کو ان سے احتراز کرنے اور ان کے مرتکبین کو منع کرنے اور ان کے ساتھ جہاد کرنے کے وسائل کا علم ہوتا ہے ۔

صحابہ کرام کے ایمان اور جہاد کو کیوں تمام دُنیا جہان کے ایمان اور جہاد پر فضیلت حاصل ہے ؛ اگر کوئی پہاڑ کے برابر بھی نیکی کرے تو وہ نیکی صحابہ کی ایک سیر بھر بلکہ پاؤ بھر نیکی کے برابر بھی نہیں ہوتی ۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ خیر اور شر دونوں کے عالم تھے ۔ اُن کی نظروں میں ایمان اور عملِ صالح کی قدر تھی اور کفر و معصیت اُن کے نزدیک مبغوض ترین چیز تھی ۔

یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے مرض اور تنگدستی کا مزا چکھا ہے، وہ دولت اور صحت کی قدر خُوب پہچانتا ہے اور اس کی لذّت کا بھی وہی ٹھیک احساس کرسکتا ہے۔ مشہور ضرب المثل ہے:

الاشیاءُ تعرفُ باَضدَادِھَا ۔ ؎

والضد یظھر حسنۃ الضد | ویضدھا تبتین الاشیاء

حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے :

لست بخب ولا یخدعنی الخب فالقلب السلیم المحمود الذی یرید الخیر لھا الشر | مجھے کوئی پوشیدہ بات دھوکے میں نہیں رکھ سکتی۔ پس قابلِ تعریف قلب سلیم وہ ہے جو نیکی کو پسند کرتا ہو، برائی کو پسند نہ کرے

کمال انسانی یہی ہے کہ نیکی اور بُرائی کو پہچانے۔ پس جو شخص شر کو نہیں پہچانتا تو یہ کوئی قابلِ

تعریف صفت نہیں، بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک گونہ نقص ہے۔

بُنیادِ فضل و کمال

با ایں ہمہ اس کو ایک قاعدۂ کلیہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ جس شخص نے کُفر اور معصیت کا بطور ذوق اور وجدان کے احساس کیا ہے، وہ خواہ نخواہ کسی ایسے شخص سے افضل ہوگا، جس کو کبھی کفر اور معصیت سے واسطہ نہیں پڑا۔ کیونکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ طبیب جملہ امراض کا عالم ہوتا ہے اور وہ ہر ایک مرض کی حالت اور کیفیت کو مریض سے بہتر جانتا ہے۔ حالانکہ بہت کم امراض ایسے ہوتے ہیں جن کو وہ ذوق اور وجدان اور ذاتی تجربہ کے طور پر جانتا ہو۔ انبیاء علیہم الصّلوٰۃ و السّلام بھی دراصل رُوحانی اطبّا ہیں اور ان کو اُن تمام امور کا بخوبی علم ہے جو قلوب کی صلاح یا فساد کا موجب ہو سکتے ہیں، اگرچہ تجربہ اور وجدان کے طور پر اُن کو شرور اور معاصی و ذنوب کا وہ علم نہیں ہوتا جو دوسرے لوگوں کو حاصل ہے۔

تلخیصِ مضمون

ہماری پہلی تحریر کا ملخص صرف اس قدر ہے کہ بعض اشخاص کو شر اور معصیت کا تجربی اور وجدانی علم ہونے سے اُس سے وہ نفرت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ اُس کو ایسا مبغوض سمجھتے ہیں جو بصورتِ دیگر متصور نہیں۔ مثلاً ایک شخص مُشرک یا یہودی یا عیسائی رہ چکا ہے، اور اس کو اُن شُبہات اور اعتراضات کا علم ہے جو مخالفینِ اسلام اُس کی حقانیت اور خوبیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے وارد کیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد اُس کو اللہ تعالیٰ حق پہچاننے کی توفیق عنایت فرماتا ہے اور اُس کو اسلام کے محاسن اور خوبیاں سمجھا دیتا ہے تو ایسا شخص اکثر اوقات اسلام میں زیادہ راسخ اور ثابت قدم ہوتا ہے، بمقابلہ اُس شخص کے جس نے کفر اور اسلام دونوں کی حقیقت کا علم حاصل نہیں کیا۔ اِس لئے کبھی تو اُس کے دِل میں اسلام اور کُفر کے متعلق محبّت اور بُغض کا جذبہ بہت کمزور ہوتا ہے اور کبھی وہ اوّل الذکر کی مدح اور مؤخّر الذکر کی مذمّت کرنے میں فقط دوسروں کی تقلید کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جس نے

بھوک کا مزا چکھا ہو، پھر اُس کے بعد سیر ہو کر کھانا کھایا ہو، یا جو بیمار ہوا، پھر اُس کے بعد صحت یاب ہوا، یا جس نے خوف کے بعد امن کی حالتوں کو دیکھا ہو۔ پس ابن امن و راحت، فقر و فاقہ، رنج و غم کی سب حالتوں کا اندازہ شناس اُس سے بدرجہا بہتر و افضل ہے جو اِن کلفتوں اور راحتوں میں مُبتلا نہ ہوا ہو۔

اہل بدعت کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اپنے فسق و فجور کی حالت میں داخل اسلام ہوئے، پھر اللہ تعالےٰ نے اُن پر حق و صداقت کا دروازہ کھول دیا اور وہ تائب ہو گئے۔ انہیں توبۃ النصوحا کا مقام حاصل ہوا اور جہاد فی سبیل اللہ کی حقیقت سے شاد کام ہوئے پس اُن کا حال، اُن کی ہجرت اور اُن کا جہاد زیادہ فضیلت رکھتا ہے، اُن لوگوں سے جنھوں نے اِن حالتوں کی چاشنی نہیں چکھی۔ چنانچہ نعیم بن حماد خزاعی رح سے منقول ہے کہ "میں جہمیہ کے مقابلہ میں اس لئے سخت ہوں کہ میں خود پہلے جہمیہ تھا"۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جَاهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ ( )	اور جن لوگوں نے ستائے جانے اور فتنہ سے تنگ آجانے کے بعد ہجرت کی، پھر انہوں نے جہاد کیا اور تکلیفوں کو برداشت کیا، بلا شبہ تیرا پروردگار اس کے بعد بخشنے والا مہربان ہے

حضرت عمر بن الخطاب اور خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو صحابہ کرام میں جو درجہ اصل تھا، وہ کسی ایسے شخص سے پوشیدہ نہیں جو اسلام کی تاریخ سے واقف ہے۔ ایمان وعمل صالح کا معاملہ ہو، یا کفار مشرکین سے جہاد کا کمال ہو، خواہ اللہ اور اُس کے رسُول کی نصرت فرمائی کا۔ خصوصاً حضرت عمر رض کو تو تمام مسلمانوں پر (جس میں صحابہ بھی شامل ہیں) سوائے ابو بکر صدیق رض کے تفوق حاصل ہے، کیونکہ وہ مجسّمہ ایمان و اخلاص تھے۔ صداقت و معرفت کے عرفان، اعلیٰ درجہ کے صاحب فراست اور سیاستدان تھے، ایسا نُور الٰہی تھے جو ہوائے نفس سے پاک ہو، اور اقامتِ دین کے معاملہ میں بُلند پایہ اور باہمت سپہ سالار تھے۔

الغرض، فضائل اور کمالات کا موازنہ کرتے وقت انتہا اور آخر حال کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ ابتدائی حالت کا کچھ لحاظ نہیں رکھنا چاہیئے۔

باب ۷

توبہ اور نجاتِ دارین

فصل ۱

ذریعہ محبوبیتِ خداوندی

رضائے الٰہی کی انتہا

اسرائیلیات میں سے ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا:

امّا الذنب فقد غفرناہ و امّا الودّ فلا یعود۔	گناہ تو ہم نے معاف کر دئے، اور لیکن دوستی واپس نہیں لوٹ سکتی۔

اگر اس حکایت کی صحت کو دُرست مان لیا جاتا تو اس کی موجودگی میں ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آوردہ شریعت اور دین کا نام بھی نہ لے سکتے۔ کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین توبہ کے معاملہ کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اگلی تمام شریعتوں میں سے کسی نے بھی اس طرح پیش نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

انا نبی الرحمۃ وانا نبی التوبۃ۔	میں رحمت والا نبی ہوں اور توبہ والا نبی ہوں۔

بلاشبہ دینِ اسلام نے وہ تمام بندشیں اور رُکاوٹیں دُور کر دی ہیں جو پہلے مذاہب میں موجود تھیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ الخ (۲ : ۲۲۲)	بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

صحیحین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث منقول ہے :

ان اللہ تعالیٰ یفرح بتوبۃ التائب اعظم من فرح النآید لما یحتاج الیہ من الطعام والشراب والمرکب اذا وجدہ بعد الیاس۔	بے شک اللہ تعالیٰ کسی توبہ کرنے والے کی توبہ سے اُس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جس کی اونٹنی کھانے پینے کے سامان سے لدی ہوئی گم ہو جائے اور وہ اس کی تلاش کر کر کے مایوس ہو جائے اور پھر وہ اچانک اُسے مل جائے۔

افضلیتِ اعمال

اب تم خود سمجھ لو کہ جس سے خدائے تعالیٰ محبّت رکھتا ہے اور جس سے وہ خوش ہے، کیا اُس کے گناہ کا کوئی اثر باقی رہ سکتا ہے، جس کو فضائل اور کمالات کے موازنہ کے وقت ملحوظ رکھنا لازم ہے؟ بے شک وہ توبہ کے بعد خدائے تعالیٰ کا محبوب ہے۔ جب خوشی اور محبّتِ الٰہی کا یہ حال ہے تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ " اِنَّهٗ لَا یَعُوْدُ لِمُوَدَّتِهٖ (وہ اپنی دوستی کو واپس نہیں لاتا۔ بالفاظِ دیگر توبہ کرنے والا محبتِ الٰہی کھو بیٹھتا ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے :

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ، ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ، فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ، (۸۵ : ۱۳، ۱۶)	وہ بخشنے والا، دوستی رکھنے والا، بزرگی والے عرش کا مالک ہے، جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔

لیکن اُس کی دوستی اور اُس کی محبّت کی کمی بیشی اس لحاظ سے ہوتی ہے، جس لحاظ سے آدمی تقرب الی اللہ حاصل کرتا اور توبہ و انابت کو ذریعہ حصول بناتا ہے۔ اور اگر اس کے وہ اعمالِ صالحہ جو وہ توبہ کے بعد عمل میں لاتا ہے، قبل از توبہ کے اعمال سے افضل ہیں تو اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی بعد از توبہ کی دوستی، قبل از توبہ دوستی سے زیادہ بلند مرتبہ ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو معاملہ خراب ہو جاتا۔ کیونکہ جزائے اعمال بھی ایک جنس ہے اور خدا بندوں کو پورا پورا بدلہ دیتا ہے۔ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (۴۱ : ۴۶) وہ بے انصافی نہیں کرتا۔

مفصلۂ بالا آیت شریفہ اور حدیث کو پڑھ کر اس حدیثِ قدسی کا مضمون بھی ملحوظ رکھنا

لازم ہے جو صحاح میں منقول ہے:

مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِمِثْلِ اَدَاءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اَحْبَبْتُہٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یَبْصُرُ بِہٖ وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا وَرِجْلَہُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِھَا فَبِیْ یَسْمَعُ وَبِیْ یَبْصُرُ وَبِیْ یَبْطِشُ وَبِیْ یَمْشِیْ وَلَئِنْ سَئَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّہٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّہٗ وَمَا تَرَدَّدْتُّ فِیْ شَیْءٍ اَنَا فَاعِلُہٗ تَرَدُّدِیْ فِیْ قَبْضِ نَفْسِ عَبْدِیْ الْمُؤْمِنِ یَکْرَہُ الْمَوْتَ وَاَکْرَہُ مَسَاءَتَہٗ وَلَا بُدَّ لَہٗ مِنْہُ۔

جو شخص میرے کسی دوست کو دشمن سمجھتا ہے تو یقیناً میری طرف سے اُسے اعلانِ جنگ ہے۔ میرا بندہ اُن فرائض کی ادائیگی سے میرا قرب نہیں پاتا بلکہ میرے قرب کے لئے کثرتِ نوافل کا شغل اختیار کرتا ہے حتیٰ کہ مجھے اس سے محبت ہو جاتی ہے پھر میں اُسکے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اسکی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اُسکے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے پس وہ مجھ ہی سے سنتا اور مجھ ہی دیکھتا اور مجھ ہی سے پکڑتا اور مجھ ہی سے چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں ضرور پورا کرتا ہوں اور اگر میری پناہ چاہے تو اُسے پناہ دیتا ہوں اور جو کچھ میں چاہتا ہوں کر لیتا ہوں کیونکہ میرا چاہنا میرے اپنے قبضہ میں ہے۔ میرا بندہ موت سے کراہت کرتا ہے اور میں اس کی برائی ناپسند کرتا ہوں اور یہ اس کے لئے ضروری ہے۔

افضل بعد از انبیاء

یہ بھی معلوم ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد افضل ترین لوگ مہاجرین و انصار ہیں جو سابقین اولین میں سے تھے اور اپنے پروردگار سے محبت اور دوستی کا دم بھرتے تھے اور وہ بھی قبل از اسلام کفر و فسق، عصیان و طغیان سے توبہ کے بعد اس مقام عالی پر فائز ہوئے تھے۔ اُن کی دوستی اور محبت کا یہ تقرب فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل کے ذریعے حاصل ہوا۔ اس طرح وہ خدا کے محبوب و معشوق اور دوست

محبِ صادق بن گئے - اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَ اللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ - (۶۰ : ۷)

عنقریب اللہ تعالیٰ تمہارے اور اُن لوگوں کے درمیان جو تمہارے ساتھ عداوت رکھتے ہیں، آپس کی اُلفت پیدا کر دیگا اور اللہ اس بات پر قادر ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے -

یہ آیت اُن مشرکوں کے بارہ میں نازل ہوئی، جنہوں نے جنگِ احزاب میں اللہ اور اُس کے رسُول کے ساتھ دشمنی کی تھی، جیسے ابوسفیان بن حرب، ابوسفیان بن حرث، حرث بن ہشام، سہیل بن عمر، عکرمہ بن ابوجہل، صفوان بن اُمیہ، وغیرہ - پھر انہی لوگوں نے اپنی دشمنی کے بعد رسول اللہ اور مسلمانوں سے خدا کو درمیان لاکر دوستی کا عہد و پیمان باندھا تھا، اور یہی اُن کی فضیلت کی وجہ ہے - پھر عکرمہ، سہیل، حرث بن ہشام، تینوں کی دوستی ابوسفیان رضی کی دوستی سے بھی افضل ہے -

نیز صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ :

ان هندا امراة ابی سفیان اُم معاویۃ قالت واللہ یا رسول اللہ ما کان علی وجہ الارض اهل خباء احب الی ان یذلوا من اهل خبائك و قد اصبحت وما علی وجه الارض اهل خباء احب الی ان یعزوا من اهل خبائك فذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم نحو ذالك -

ابوسفیان رضی کی بیوی ہندہ نے کہا جو معاویہ رضی کی ماں تھی : خدا کی قسم اے اللہ کے رسول ! روئے زمین پر کوئی بھی گھرانہ نہیں تھا جو مجھے زیادہ محبوب ہو اگر وہ ذلیل ہوں آپ کے گھرانہ سے، اور اب میری یہ حالت ہوگئی ہے کہ روئے زمین پر کوئی گھرانہ نہیں جسے زیادہ محبوب جانوں اگر وہ زیادہ معزز ہوں آپ کے گھرانہ سے - نبی صلعم نے ایسا ہی بیان فرمایا ہے -

نیز یہ مسلم امر ہے کہ مومنوں کی محبت اور دوستی، اللہ کی محبت کے تابع ہے - کیوں کہ موثق ترین ایمان الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ہے - پس اللہ کے لئے محبت کمالِ توحید سے

حاصل ہوتی ہے، اور اللہ کی سی محبت کرنا شرک ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔ (۲ : ۱۶۵)

انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے بھی ہیں جو خدا کو چھوڑ کر دوسری ہستیوں کو اس کا شریک بنا لیتے ہیں، جنھیں وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہئے، حالانکہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ محبوب اللہ کو سمجھتے ہیں

دوستی اور دشمنی کا اصول یہی دوستی رسول اور مومنوں کے مابین ہوتی اور ان مشرکین کے درمیان بھی ہوتی، جنھوں نے اُن کے ساتھ دشمنی کی ہوتی۔

حقیقی دوستی اور محبت وہی ہے جو صرف اللہ کے لئے ہو۔ جو اللہ کو محبوب جانتا ہے، اللہ اُسے محبوب رکھتا ہے اور جو اللہ کو دوست بناتا ہے، اللہ اُسے دوست بنا لیتا ہے۔ پس جان لو کہ توبہ کے بعد اللہ انہیں اس طرح محبوب اور دوست بنا لیتا ہے جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ توبہ کرنے والا بخشش تو حاصل کر لیتا ہے مگر دوستی حاصل نہیں کرتا۔

اگر سائل کا یہ اعتراض ہو کہ کافر ہونے کی وجہ سے وہ یہ نہیں جانتے کہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ فعل حرام ہے، بلکہ وہ تو جاہل تھے، اس لئے نادانستہ ایک حرام فعل کے مرتکب ہوئے۔

اِس کا جواب دو طرح پر ہے :

اوّل تو یہ بات غلط ہے کہ انھوں نے نادانستہ ارتکابِ حرام کیا ہو کیونکہ اکثر کافر بھی جانتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور حسد و تکبّر کی بنا پر آپؐ سے دشمنی کرتے تھے۔ جیسے مثلاً ابوسفیان نے رسول اللہ صلعم کی نبوّت کی خبریں عام یرموک میں اُمیّہ بن ابوصلت اور ہرقل بادشاہِ روم سے سُنی تھیں، پھر بھی وہ اسلام کا بہی خواہ نہ بنا اور اللہ اور اُس کے رسولؐ سے بہت بڑی دشمنی کرتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ مشرف بہ اسلام ہُوا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۙ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۙ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۔ (۲۵ : ۶۸ تا ۷۰)

جو لوگ اللہ کے ہمراہ کسی دوسرے معبود کی پرستش نہیں کرتے اور جس جان کو مارنا حرام کر دیا ہے، اُسے نہیں مارتے مگر حق کے ساتھ، اور نہ ہی وہ زنا کرتے ہیں۔ جو شخص ایسا کریگا، وہ سخت عذاب پائیگا، قیامت کے دن اُسے عذاب دُگنا کر دیا جائیگا اور وہ ذلیل ہو کر اس میں ہمیشہ رہے گا۔ مگر جو شخص توبہ کرے اور نیک کام کرے، یہی لوگ ہیں جن کے گناہ نیکیوں سے بدل دیگا۔

پس نیکیاں ہی ہیں جو اُن کے لئے اللہ کی دوستی کا موجب ہوئیں اور بُرائیوں کو نیکیوں سے بدلنا اُن لوگوں کے لئے مخصوص ہرگز نہیں ہے جو کافر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ سب کی توبہ کو شرفِ قبولیت حاصل ہوتا ہے :

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۔ (۴ : ۱۷)

اللہ کے حضور توبہ کی قبولیت اُنہی لوگوں کے لئے ہے جو بُرائی کی کوئی بات نادانی و بے خبری سے کر بیٹھتے ہیں، تو پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ تو ایسے ہی لوگ ہیں اللہ اُن کی توبہ قبول فرما لیتا ہے، یقیناً اللہ سب کچھ جانتا حکمت والا ہے

حضرت ابوالعالیہؒ کہتے ہیں کہ میں نے صحابہؓ سے اس آیتِ کریمہ کے متعلق دریافت کیا تو اُنہوں نے فرمایا: جس کسی نے اللہ کی نافرمانی کی، وہ جاہل ہے، اور جس کسی نے مرنے سے پہلے توبہ کر لی، تو اس کی توبہ عنقریب قبول ہو گی۔

معیارِ محبوبِ اللہ

دوسری دونوں قسم کی توبہ کے درمیان جو فرق بیان کیا جاتا ہے، خواہ گنہگار کی توبہ ہو یا مطلق توبہ، تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں انکی اصل کتاب و سُنت ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور

خوش ہوتا ہے، خواہ وہ جانتے ہوں کہ وہ گنہگار ہیں یا نہ جانتے ہوں۔ اس لئے جو شخص اپنے کو مجرم گردان کر توبہ کریگا تو ضروری ہے کہ اُس کی مذموم صفت محمود سے بدل دی جائے، یعنی اگر وہ حق کو مبغوض جانتا تھا، تو وہ اُسے محبوب جاننے لگے گا، اور اگر باطل چیز سے محبت کرتا تھا، تو وہ اُسے ناپسند کرنے لگ جائیگا۔ پس اس طرح توبہ کرنے والے کو معرفتِ حق حاصل ہو گی۔ حق کو اچھا سمجھ کر اس پر کاربند ہو جائیگا اور باطل کو بُرا جان کر اس سے اجتناب کرے گا۔ سو یہی باتیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ پسند فرماتا، ان سے خوش ہوتا اور محبت کرتا ہے۔ اس طرح جس بندہ کا بھی جو کام محبوبیتِ حق میں جس قدر عظیم ہوگا، حق تعالیٰ بھی اُسی قدر عظیم محبت سے پیش آئیگا اور اُسے مکروہاتِ حق سے پھیر کر پسندیدہ کاموں کی طرف منتقل کر دیگا اور ساتھ ہی وہ اسی قوت کے ساتھ، جس سے وہ باطل کو مبغوض جانیگا، خدا کی پسندیدہ چیزوں کو محبوب سمجھنے لگ جائیگا۔ پس یہ محبت حق کی زیادتی کا موجب ہو گی اور اُسکی دوستی سے بہرہ مند ہونے کی بھی لیکن اللہ تعالیٰ اس کی برائیوں کو نیکیوں سے اس لئے بدل ڈالیگا کہ اس نے اپنی مذموم صفات کو محمود اور قابلِ تعریف بنا لیا ہے۔ جزائے اعمال بھی چونکہ ایک جنس ہے، اور جب توبہ کرنے والا خدا کی پسندیدہ چیزوں کا راس المال بہ نسبت دوسروں کے زیادہ لے کر آئیگا۔ تو خدا کی محبت بھی عظیم ترین ہو گی اور جب اُس کے کام جن کو اللہ دوست رکھتا ہے، توبہ قبول کرنے سے پہلے کاموں سے زیادہ ہونگے تو اللہ تعالیٰ بھی توبہ کرنے کے بعد اس سے زیادہ دوستی کا ہاتھ بڑھائے گا۔ پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ:

المؤدۃ لا یعود ۔ (خدا کی دوستی حاصل نہیں ہوتی)

الغرض، یہ کہنا، جیسے کہ بعض اسرائیلیات سے منقول ہے کہ "توبہ کرنے سے مغفرت تو حاصل ہو جاتی ہے، لیکن خدا کی دوستی حاصل نہیں ہوتی اور اُس کی محبت سے انسان محروم رہتا ہے"، یہ ایک سراسر لغو اور باطل قول ہے۔

فصل ۲

اہلِ تشیع کے عقیدہ کی تردید

قبل از نبوّت معصومیٔ انبیاءؑ اس تقریر سے اُن لوگوں کے شبہ کا جواب ہو جاتا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ نبی کے لئے ضروری ہے کہ نبوّت سے پہلے بھی وہ گناہوں سے معصوم ہو۔ جیسے کہ بعض اہلِ تشیّع کا اعتقاد ہے۔ اور اسی طرح جس نے کہا کہ ہر نبی کے لئے ضروری ہے کہ نبوّت سے پہلے بھی مومن ہو۔ کیونکہ ان لوگوں کو یہی غلط فہمی ہے کہ کسی گناہ کا صادر ہونا ہمیشہ کے لئے اُس کے مرتکب کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگ جاتا ہے، چاہے اُس نے اس سے توبہ کر لی ہو۔ لیکن ہم نے تم پر ثابت کر دیا ہے کہ سچی توبہ کے بعد آدمی خدائے تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور گذشتہ افعال سے اس کی تنقیص نہیں کی جا سکتی۔ اور جو لوگ اس کو نقص خیال کرتے ہیں، وہ بھاری غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جو مذمت اور عقوبت، کسی گناہ کا نتیجہ ہو سکتی ہے، وہ اس شخص کے لئے ہرگز نہیں جو اُس سے تائب ہو چکا ہے۔

تاخیرِ توبہ و توقّف قابلِ پاداش البتہ اگر گناہ صادر ہونے کے بعد توبہ میں تاخیر کی جائے، تو اُس تاخیر اور توقّف کے مناسبِ حال سزا کا وہ مستوجب ہوگا۔ لیکن انبیاء علیہم السّلام نے کبھی توبہ میں تاخیر نہیں کی۔ اور اگر بالفرض کسی نے کچھ تاخیر کی، تو اللہ تعالیٰ نے فوراً اُس کو آزمائش میں ڈالا۔ جس سے اُس کا کفارہ ہو گیا، چنانچہ ذی النّون (یونس علیہ السّلام) کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ نبوّت کے بعد یہ واقعہ پیش آیا اور جو شخص کہتا ہے کہ قبل از نبوّت ہے تو یہ بات چنداں قابلِ التفات نہیں، کیونکہ کفر و ذنوب سے توبہ کرنے والے بہرحال اُن لوگوں سے افضل

ہیں جو سرے سے کفر و ذنوب میں ملوّث نہیں ہوئے۔ جب اُن کی فضیلت متحقق ہو گئی، تو ضروری ہے کہ فضیلت والے نبوّت کے زیادہ حقدار ٹھہریں۔

بطلانِ عقیدہ باطلہ

بہر کیف قرآن کریم کے نصوص اس قول کو باطل قرار دیتے ہیں کہ توبہ کے بعد بھی انسان اللہ تعالیٰ کی محبّت سے محروم رہتا ہے، مثلاً حضرت یوسف علیہ السّلام کا قصہ قرآن مجید میں پڑھو تو تم کو واضح ہوگا کہ آپ کے بھائیوں نے آپ کے ساتھ کیا کچھ کیا اور کن کن گناہوں کے وہ مرتکب ہوئے۔ لیکن با ایں ہمہ اسباطِ یعقوب علیہ السّلام کا نبی ہونا قرآنِ کریم کی آیات میں ثابت ہے۔ خود حضرت یوسف علیہ السّلام توبہ کے بعد اُن سے اس طرح مخاطب ہوئے ہیں کہ:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (۱۲: ۹۲)،	آج تم پر کچھ ملامت نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا قصہ بیان فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۔ (۲۹: ۲۶)	پس اُن پر لوطؑ ایمان لے آئے اور کہا بیشک میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔

جس کے بعد اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لُوط علیہ السّلام کو اپنی قوم کی طرف پیغمبر کر کے بھیجا، اور اُن کی پیغمبری کا قصّہ کئی جگہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔

حضرت شعیب علیہ السّلام کے قصّے کے اثنا میں آتا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۝ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ۭ	شعیب علیہ السّلام کی قوم کے گردن کشوں نے کہا۔ اے شعیب! ہم تم کو اور جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں، اُن کو بھی اپنی بستی سے نکال دیں گے۔ یا یہ کہ تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔ شعیبؑ نے کہا، اگر ہم تمہارے دین سے متنفر ہوں، تب بھی؟ جب اللہ نے ہمیں تمہارے باطل مذہب سے نجات بخشی ہے تو اگر اب ہم تمہارے

وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللهُ رَبُّنَا، وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا، عَلَى اللهِ تَوَكَّلْنَا، رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ - (۷ : ۸۸، ۸۹)

میں لوٹ آئیں تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ ہم نے اللہ پر جھوٹ باندھا، اور ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہاری طرف لوٹیں، مگر جو کچھ ہمارا رب چاہے، ہمارے ربّ کا علم ہر ایک چیز کو گھیرے ہوئے ہے ہمیں اللہ پر پورا بھروسہ ہے - اے رب! میرے اور میری قوم کے درمیان حق کھول دے اور تو بہتر کھولنے والا ہے (حق کا) -

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا فَأَوْحَى إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ، وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ذَالِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ - (۱۴ : ۱۳/۱۴)

منکروں نے اپنے رسولوں سے کہا: ہم تمہیں اپنے ملک سے ضرور نکال باہر کرینگے، یا پھر تم ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ - ہم نے رسولوں پر وحی بھیجی، اب ہم اِن ظالموں کو ہلاک کر ڈالیں گے اور ان کے بعد تمہیں اس سرزمین میں جگہ دینگے - یہ اس کے لئے ہے جو ہماری حکومت سے ڈرا اور ہماری وعید سے خائف ہوا -

الغرض، گناہ صادر ہو جانے کے بعد تائب ہونا تنقیص کا موجب نہیں بلکہ توبہ بھی منجملہ دیگر فضائل اور کمالات کے ایک فضیلت اور کمال ہے -

بلا استثناء فرضیتِ توبہ

حصولِ کمال کا ذریعہ

ہر ایک شخص پر توبہ فرض کی گئی ہے، کیونکہ توبہ ہی اُس کے لئے حصولِ کمال کا ذریعہ ہے۔ کلام مجید میں ہے :

اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔

(۳۳ : ۷۳)

بیشک نوعِ انسانی بہت ظالم اور جاہل ہے، اس کا انجام اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دیگا۔ اور مومن مردوں اور عورتوں پر (اُن کی توبہ کی وجہ سے) رحمت کے ساتھ رجوع فرمائیگا اور بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

بالفاظِ دیگر نوعِ انسانی کے ہر ایک فرد کا کمال اس میں ہے کہ وہ تائب ہو جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس پر مہربان ہوگا۔

دُوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

(۲۴ : ۳۱)

مومنو! تم سب کے سب اللہ کی طرف رجوع کرو (اُس کی بارگاہ میں تائب ہو جاؤ) تب یہ اُمید رکھو کہ تم کامیاب ہوگے۔

مورِدِ عنایاتِ الٰہی اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں اس بات کی خبر دی ہے کہ آدمؑ اور نوح علیہما السلام اور دیگر انبیائے عظام حتیٰ کہ خاتم النّبیّین صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ کی اور موردِ عنایات ہوئے۔ سب سے آخر میں جو آیتیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں، اُنہیں میں سے ایک آیت یہ ہے:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ، اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔

(۱۱۰ : ۱ تا ۳)

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نُصرت اور فتحمندی کا ظہور ہو، اور تم دیکھو کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دین میں جوق درجوق داخل ہو رہے ہیں تو تم اللہ تعالیٰ کی پاکی اور اُس کا حمد بیان کرو اور اس سے مغفرت طلب کرو بیشک وہ توبہ قبول کرنیوالا اور رجوع کرنے والا ہے۔

اُسوۂ نبوی

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد آپؐ اکثر رکوع و سجود میں یہ الفاظ دُہرایا کرتے تھے:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ۔

پاک ہے تو اے اللہ ہمارے پروردگار! اور تیرے لئے ہی سب تعریف ہے، یا اللہ مجھے بخش دے۔

یہ قرآن حکیم کی تاویل ہے، اور اس سے قبل فرمایا ہے:

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ، اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔

(۹ : ۱۱۷)

بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اُن مہاجرین اور انصار کی توبہ قبول فرمائی جنہوں نے تنگی کے وقت میں آپ کا ساتھ دیا۔ ان کے توبہ کرنے اور پھر ان کی توبہ مقبول ہونے سے پیشتر قریب تھا کہ اُن میں سے ایک فریق کے دل راہِ راست سے منحرف ہوں۔ اس حالت کے بعد اللہ نے اُن پر رحمت کے ساتھ رجوع فرمایا اور اُنکی توبہ قبول کی۔ بیشک وہ اُن پر نہایت ہی مہربان ہے۔

ستّر بار سے زیادہ مرتبہ توبہ

صحیح بخاری میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ قول منقول ہے کہ:

يَا اَيُّهَا النَّاسُ! تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ رَبِّكُمْ، فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنِّيْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ اَكْثَرَ مِنْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً۔

لوگو! اللہ کی طرف رجوع کرو اور تائب ہو جاؤ۔ مجھے اُس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ بیشک میں دن بھر میں ستّر سے بھی زیادہ مرتبہ اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور اُسکی بارگاہ میں تائب ہوتا ہوں۔

فصل ۴

استغفار کی دُعائیں

سَو سَو بار توبہ صحیح مسلم میں اغر المزنی رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انی لیغان علیٰ قلبی و انی لاستغفر اللہ فی الیوم مائۃ مرۃ۔	بیشک میرا قلب گا تا ہے اور دن میں سَو بار اللہ سے بخشش مانگتا ہوں۔

سُنن میں ابو عمرؓ سے منقول ہے کہ ہم گنتے تھے کہ رسول اللہ صلعم نے ایک ہی مجلس میں سو بار کہا:

رَبِّ اغفرلی و تُب علیَّ انّکَ انت التوّاب الغفور۔	میرے پروردگار! مجھے بخش دے اور میری توبہ قبول فرما۔ بیشک تو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا بخشنے والا ہے۔

قومہ نماز کی دُعا صحیحین میں ابو موسیٰ اشعری رضؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں یہ دُعا پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ وَجَھْلِیْ وَاِسْرَافِیْ فِیْ اَمْرِیْ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنِّیْ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ھَزْلِیْ وَجِدِّیْ وَخَطَائِیْ وَعَمَدِیْ وَکُلَّ ذٰلِکَ عِنْدِیْ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنِّیْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ	یا اللہ! میری خطاؤں، میری نادانی اور میرے کاموں میں میرا اسراف اور جو میرے عیوب تجھ پر ظاہر ہیں، سب معاف فرمادے۔ یا اللہ! میری ہزلیات اور میری قصداً خطائیں اور بھول چوک اور ایسی ہی میری اور غلطیاں بخش دے۔ یا اللہ! میری مقدم و مؤخر اور پوشیدہ اور علانیہ کی خطائیں اور جو کچھ عیوب تو میرے متعلق جانتا ہے، سب معاف فرمادے۔ تو ہی مقدم ہے اور تو ہی مؤخر ہے اور تو ہی ہر طرح کی سب باتوں پر

وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ | قادر ہے۔

تکبیر تحریمہ اور قراءۃ کی درمیانی دعا

نیز صحیحین میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا، یا رسول اللہ! تکبیر اور قراءۃ کے درمیان خاموش رہ کر آپؐ کیا پڑھتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا" میں یہ دعا پڑھتا ہوں:

اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اَللّٰھُمَّ نَقِّنِیْ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ اَللّٰھُمَّ اغْسِلْ خَطَایَایَ بِالْمَآءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ۔

بارخدایا! میرے اور میرے گناہوں کے درمیان مشرق اور مغرب کا فاصلہ ڈال دے۔ بارخدایا! مجھے گناہوں سے اس طرح پاکیزہ بنا دے جیسے سفید کپڑے کو میل کچیل سے اُجلا کر دیا جاتا ہے۔ بارخدایا! میرے گناہوں کو (رحمت کے) پانی اور برف اور اولوں سے دھو ڈال۔

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے کہ آپؐ رکوع سے سر اُٹھا کر بھی یہی الفاظ زبان پر لاتے تھے۔

آغازِ نماز کی دُعا

نیز صحیح مسلم میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے شروع میں یہ دُعا پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ رَبِّیْ وَاَنَا عَبْدُكَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَعَمِلْتُ سُوْٓءًا فَاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ، اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا یَھْدِیْ لِاَحْسَنِھَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّیْ سَیِّئَھَا فَاِنَّهٗ لَا یَصْرِفُ عَنِّیْ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ۔

بارخدایا! تو بادشاہ ہے، تیرے بغیر کوئی اور معبود نہیں۔ تو میرا پروردگار ہے اور میں تیرا بندہ ہوں میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور برائیاں کیں۔ بیشک سوائے تیرے اور کوئی گناہوں کا بخشنے والا نہیں بارخدایا! مجھ کو بہترین اخلاق واعمال کی ہدایت فرما سوائے تیرے اور کوئی یہ ہدایت دینے والا نہیں، اور بُرے اخلاق واعمال مجھ سے دُور رکھ، بیشک تیرے سوا اور کوئی مجھ کو ان سے دُور نہیں رکھ سکتا۔

سجدے کی دُعا اسی طرح صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں کہا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ كُلَّهٗ دِقَّهٗ وَ جِلَّهٗ وَعَلَانِيَتَهٗ وَسِرَّهٗ وَاَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ۔	بار خدایا! میرے تمام گناہوں کو بخش دے، چھوٹے اور بڑے، ظاہر اور پوشیدہ، اگلے اور پچھلے۔

سواری کی دُعا و تلقین سُنن کی کتابوں میں حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب سواری لائی گئی تو آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی تعریف کی اور یہ آیت پڑھی:

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ، وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۔ (۴۳ : ۱۴)	پاک ہے وہ خدا جس نے اس قسم کی سواریوں کو ہمارے لئے مسخر کیا، حالانکہ ہم اُن کے مقابلے کے نہیں تھے اور بیشک ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

پھر تکبیر کہہ کر حمد کے الفاظ زبان پر لائے اور کہا:

سُبْحٰنَكَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ۔	تُو پاک ہے، میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا، مجھ کو بخش دے۔ بیشک تیرے سوا کوئی اور گناہوں کی مغفرت نہیں فرماتا۔

پھر آپؐ نے ہنس دیا اور فرمایا:

اِنَّ الرَّبَّ يُعْجَبُ مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا قَالَ اغْفِرْ لِیْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ۔	بے شک پروردگارِ عالم اپنے بندے پر تعجب کرتا ہے جب وہ کہتا ہے: خدایا مجھے بخش دے کیونکہ تیرے سوا گناہوں کا بخشنے والا کوئی نہیں۔

قرآنِ کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا ہے:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ۔ (۴۷ : ۱۹)	تم اپنے گناہوں کے لئے اور دیگر مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لئے مغفرت طلب کرو۔

قرآن شریف میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔ (۴۸ : ۱، ۲)	بے شک ہم نے تم کو نمایاں فتحمندی عنایت کی اور بالآخر اللہ تعالےٰ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہوں کو بخش دے گا۔

صحاح میں روایتِ شفاعت میں ثابت ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی اُمت کو جب وہ اُن کے پاس شفاعت کی غرض سے حاضر ہونگے تو فرمائیں گے :

اذهبوا الى محمّد عبد غفر الله لهٗ ما تقدّم من ذنبه وما تاخّر۔	محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ، اللہ تعالیٰ نے اُن کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دئے ہیں۔

دوسری حدیث میں ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اس قدر لمبا قیام فرماتے تھے کہ آپؐ کے دونوں قدم مبارک متورّم ہوجاتے۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ آپؐ کیوں اس قدر تکلیف اُٹھاتے ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا :

أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا۔	کیا مَیں اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بندہ نہ بنوں!

فصل ۵

مفسّرین کی غلط تاویلیں

فرقہ جہمیہ و باطنیہ کی توجیہ

الغرض، کہاں تک قرآن اور حدیث کے حوالے بیان کئے جائیں، اور صحابہ و تابعین اور علمائے سلف کے اقوال سُنائے جائیں۔ لیکن جو لوگ بزعمِ خود انبیاء علیہم السّلام سے گناہ صادر ہونے کو اُن کے لئے کسرِ شان خیال کرتے ہیں، وہ اِن نصوص کی اسی طرح تاویلیں کرتے ہیں، جس طرح جہمیّہ اور باطنیہ نے اسماء اور صفاتِ الٰہی تعالیٰ شانہٗ کے حقائق سے انکار کرنے کے لئے گھڑلی ہیں، جن کو تاویل کے بجائے تحریف کہنا انسب معلوم ہوتا ہے۔

غلط توجیہ کی ایک مثال

مشتے نمونہ از خروارے وہ یہ کہتے ہیں کہ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ سے آدم علیہ السلام کی لغزش مُراد ہے اور وَمَا تَاَخَّرَ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم تمہاری اُمّت کے گناہ بخش دینگے۔" یہ توجیہ بالکل غلط ہے، اور اس کے متعدّد وجوہ ہیں :

وجوہاتِ سبعہ :-

(۱) یہ آیت باتفاقِ مفسرین و اہلِ حدیث صلح حدیبیّہ کے موقع پر نازل ہوئی ہے۔ لیکن آدم علیہ السلام کا گناہ تو اُن کے زمین پر آنے سے پہلے ہی بخشا جا چکا تھا اور اُن کی توبہ قبول ہو چکی تھی، جیسے کہ قرآن شریف میں مختلف جگہوں پر یہ قصّہ پڑھنے سے واضح ہوتا ہے فرمایا:

وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ‏، ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ۔ (۲۰ : ۱۲۱/۱۲۲)	آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کی نافرمانی تو وہ بے راہ ہوگیا، پھر اُس کے پروردگار نے اُسے برگزیدہ کیا، اُسکی توبہ قبول کی اور وہ ہدایت یاب ہُوا۔

دوسری جگہ ہے :

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ‌ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۲ : ۳۷)	پھر آدمؑ نے اپنے پروردگار سے چند کلمے سیکھے۔ اللہ نے اُس کی توبہ قبول کرلی - وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے ۔

اور قرآن میں بیان کیا ہے کہ آدم علیہ السلام نے یہ دُعا کی :

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ (۷ : ۲۳)	اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر تو ہمیں نہ بخشیگا اور ہم پر ترحّم نہ فرمائیگا تو ہم ضرور زیاں کار اور نقصان اُٹھانے والے ہوجائیں گے ۔

(۲) علاوہ ازیں آدم علیہ السلام بھی تو نبی ہیں اور جو لوگ عصمتِ انبیاء کے اِن معنوں میں قائل ہیں کہ اُن سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوتا، وہ اِس بارے میں آدم اور محمد علیہما الصلوٰۃ و

السلام میں کوئی فرق نہیں کرتے، اس لئے اُن کی اس توجیہ کو مانتے ہوئے بھی دلیل کا زور قائم رہتا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے متعدد آیتیں نازل فرماکر اپنا اٹل قانون یہ بتایا ہے کہ:

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ (۶/۱۶۵) کوئی ایک شخص دوسرے کے گناہ کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔

اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ آدم علیہ السلام یا آپ کی امت کے گناہوں کو کیوں آپؐ کی طرف منسوب کیا جائے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ۔ (۲۴ : ۵۴)	اُس چیز کا بوجھ اُسی پر ہے جس نے اُسے اُٹھایا اور تم پر اُس کا بوجھ ہوگا جو تم اُٹھاؤ گے۔

اور پھر فرمایا:

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ۔ (۴ : ۸۴)	اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑائی کرو۔ تم اپنے نفس کے ہی ذمہ دار ہو۔

اگر کسی دوسرے کے گناہ کی ذمہ داری دوسرے پر عاید کرنا جائز ہوتا، تو پھر یہ بھی جائز ہوتا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے سب کے سب گناہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کئے جاسکیں، تو پھر کہا جائیگا کہ اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان کا اُن کے پاس کیا جواب ہے کہ:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ۔ (۴۸ : ۲)	اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے سب اگلے اور پچھلے گناہ بخش دئے۔

آپؐ سے قبل تمام نبیوں اور ان کی اُمتوں کے گناہوں کا جو بیان ہے تو دراصل اس سے مُراد قیامت کا دن ہے جب آپؐ سب مخلوقات کے لئے شفاعت کریں گے۔ آپؐ بنی نوعِ انسان کے سردار ہیں۔ جیسا کہ آپؐ نے فرمایا:

انا سید ولد آدم ولا فخر، آدم فمن دونہ تحت لوائی یوم القیامۃ	قیامت کے دن میں بنی نوعِ انسان کا سردار ہوں اور مجھے اس پر فخر نہیں۔ حضرت آدمؑ بھی میرے جھنڈے تلے

انا خطیب الانبیاء اذا وفدوا واما مھم اذا اجتمعوا۔	ہونگے۔ میں تمام نبیوں کا خطیب ہوں جب وہ وفد کی شکل میں خدا کے حضور حاضر ہونگے اور ان کا امام ہوں جب وہ سب جمع ہونگے۔

پس اس طرح حضرت آدم کے گناہ کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرنے سے کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ وہ تو اوّلین و آخرین سب کے گناہ آپؐ کے ذمہ لگاتے ہیں۔ اور اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ تمام اُمتوں کے گناہ نہیں بخشیگا، تو وہ کہیں گے کہ آپؐ کی تمام اُمت کے گناہ بھی نہ بخشے گا۔

(۴) اِس آیت سے کہ:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔ (۴۷ : ۱۹)	اپنے اور تمام مومن مردوں اور مومن عورتوں کے گناہوں کی بخشش طلب کرو۔

واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کا گناہ اُمت کا گناہ نہیں اور نہ ہی اُمت کے گناہ آپؐ کی طرف منسوب کئے جا سکتے ہیں۔ ورنہ صرف وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ کہنا کافی ہوتا۔ پھر ایک مومن کا گناہ کس طرح آپؐ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے؟

(۵) صحیح حدیث میں وارد ہُوا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ۔ (۴۸ : ۲)	اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے اور پچھلے سارے گناہ معاف کر دئے۔

تو صحابہؓ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا "یہ تو آپ کے لئے ہے، اور ہمارے لئے؟" اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ (۴۸ : ۵)	اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو جنّت کے باغوں میں داخل فرمائیگا جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

اور فرمایا:

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ - (   )

اللہ تعالیٰ مومنوں کے دلوں میں اطمینان اور سکینت اتارتا ہے، تاکہ اُن کے ایمان میں اور اضافہ ہو۔

اِس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم جانتے تھے کہ لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ کی آیت آپؐ ہی کے لئے ہے اور اُمت اس کے مفہوم میں داخل نہیں۔

(۶) یہ ایک یقینی بات ہے کہ اللہ تعالےٰ نے تمام اُمّت کے گناہ نہیں بخشے ہیں، (لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ مَا تَأَخَّرَ سے آپؐ کی امت کے گناہ مُراد ہیں) کیونکہ آپؐ کی اُمّت میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جن کو دُنیا ہی کی زندگی میں اور نیز آخرت میں اُن کے گناہوں پر مُواخذہ اور عذاب ہوتا ہے اور ہوگا۔ صادقِ مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بابت خبر دی ہے اور ائمہ سلف کا اس پر اتفاق ہے اور اس قسم کے واقعات روزمرّہ دُنیا میں مشاہدہ کئے جاتے ہیں، جن کا شمار اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا جیسے اس نے کلام مجید میں فرمایا ہے:

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا، وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا - (۴: ۱۲۳، ۱۲۴)

اللہ تعالیٰ کے احکام اور قوانین نہ تو تمہاری (مسلمانوں کی) آرزوں کے تابع ہیں اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوں پر کچھ منحصر ہے (خدائے تعالیٰ کا اٹل قانون تو یہ ہے)، جس شخص نے کچھ بھی بُرائی کی، وہ اُس کی سزا بھگتے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی بھی اس کا دوست اور مددگار نہیں ہوگا، لیکن جس کسی نے نیکیاں کیں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو بیشک یہ لوگ جنت میں داخل ہونگے اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائیگا۔

اِس آیت کے مضمون سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ استغفار اور توبہ ترکِ افضل پر کی جاتی ہے۔ جو شخص فضیلت کا درجہ حاصل کرتا ہے، وہ اپنی پہلی حالت سے یقیناً تائب ہوتا ہے، لیکن مذمّت اور وعید صرف گناہوں کے سرزد ہونے پر کی جاتی ہے۔

فصل ۶

مقبولیّتِ توبہ اور اعترافِ گناہ

مومن مُوحّد کی مغفرت

سائل[1] نے اپنے استفسار میں یہ بھی دریافت کیا ہے کہ کیا توبہ کی مقبولیّت اور گناہوں کی بخشش اور جو پاداش اور تکلیف گناہوں کی وجہ سے صادر ہو چکی ہے، اُسے دُور کرنے کے لئے صرف گناہ کا اعتراف کر لینا ہی کافی ہے یا کسی اَور چیز کی بھی ضرورت ہے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص موحّد ہے تو مأمور بہ کے طور پر توبہ کر لینا اُس کے لئے ہر ایک گناہ کی مغفرت کا موجب ہے۔

ناقابلِ بخشش گناہ

ساتھ ہی یہ تفصیل بھی یاد رکھ لو کہ شرک کو بغیر توبہ کے اللہ تعالےٰ کبھی نہیں بخشتا اور اس سے کم درجہ کے دوسرے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ سورۂ نساء میں دو جگہ یہ آیت آئی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ (۴ : ۴۸، ۱۱۶)	بے شک اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرماتا اور اس سے کم تر درجہ کے ہر ایک گناہ کو اگر چاہے تو بخش دے۔

اِن آیتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ شرک سے کم تر درجے کے گناہ بغیر توبہ کے بھی بخشے

---

[1] سوال نمبر ۲ کا جواب یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

لیکن اُن کی مغفرت اللہ تعالیٰ کی مشیّت کے ساتھ مشروط ہے۔ البتہ توبہ کے ساتھ سب گناہ شرک اور غیر شرک بخشے جاتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا، اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ، وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔ (۳۹: ۵۳، ۵۴)

کہہ دو، اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس مت ہونا۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو بخش دیتا ہے، بیشک وہی بخشنے والا مہربان ہے، اور تم کو چاہیئے کہ اپنے رب کی طرف رجوع کرو (تائب ہو جاؤ) اور اُس کے مطیع بن جاؤ پیشتر اس کے کہ تم پر عذاب نازل ہو، (کیونکہ) پھر تمہاری مدد نہیں کی جائیگی۔

یہاں چونکہ توبہ کے ذریعے گناہوں کا بخشا جانا مقصود ہے، اس لئے تعمیم کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ شرک اور غیر شرک سب گناہوں کو شامل ہو۔

مشرک و موحد

ایک دوسری جگہ بھی توبہ کے بعد شرک اور کفر کے بخشے جانے کی تصریح فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ۔ (۸: ۳۸)

اُن لوگوں سے کہہ دو جنہوں نے کُفر اختیار کیا، اگر وہ باز آ جائیں، تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے، وہ اُن کو بخش دیا جائے گا۔

الغرض، ایک موحد شخص جو گناہ کا اعتراف کرتا ہے، اگر اُس کا یہ اعتراف توبہ کی شروط پر مشتمل ہے تو یقیناً اس کے گناہ بخشے جائیں گے۔ جب گناہ بخشے گئے تو عقوبت بھی ٹل جاتی ہے۔ کیونکہ مغفرت کے معنی ہی گناہوں کی بُرائی سے بچانا ہے تاکہ گناہوں کی عقوبت نہ جھیلنی پڑے اور سزا نہ ملے۔

معانیِ لفظِ مغفرت

بعض علماء کا قول ہے کہ "مغفرت کے معنی پردہ پوشی کے ہیں۔ اس لئے اس کا نام مغفرت رکھا۔ لیکن غفار کے معنی ہیں" گناہوں پر پردہ ڈالنے والا"۔ اس سے مغفرت کا پورا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ کا اسمِ حسنےٰ غفار ہے، کیونکہ وہ ستار ہے کہ پردہ پوشی کرتا ہے۔ اور یہ مغفرت کے معنوں کی تقصیر ہے۔ کیونکہ مغفرت کے معنی گناہ کے شر سے اس طرح بچائے جانے کے ہیں کہ اُن پر عقوبت نہ ہو۔ تو جس کے گناہ بخشے گئے، اُسے عذاب نہ ہوگا۔ لیکن ستر یعنی پردہ ڈالنے کی حالت میں یہ ممکن ہے کہ در پردہ باطن میں اس پر عقاب یا عتاب نازل ہو جس کے بالفاظِ دیگر یہ معنی ہیں کہ گناہ کا اثر زائل نہیں ہُوا۔ البتہ یہ اَور بات ہے کہ باوجود مغفرت کے کسی کو آزمائش میں ڈالا جائے، تاکہ اس کے لئے اجر اور ثواب کی زیادتی کا موجب ہو۔ یہ مغفرت کے منافی نہیں۔

اسی طرح بعض گناہوں کے پُورے طور پر بخشے جانے کے لئے خاص نیکیوں کا بجالانا ضروری ہوتا ہے۔ یہ توبہ کے مفہوم میں داخل ہے اور اسی واسطے ہم نے مغفرت کے لئے اعتراف کے ساتھ توبہ کی شرط لگادی ہے۔

تائب اور تارک میں فرق

ایک اور نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض اوقات انسان اپنے آپ کو تائب خیال کرتا ہے حقیقت میں وہ تائب نہیں، بلکہ تارک ہوتا ہے۔ لیکن تارکِ گناہ اور تائب از گناہ میں بہت بڑا فرق ہے۔ بعض اوقات اس لئے آدمی گناہ کے ارتکاب سے بچا رہتا ہے کہ گناہ کا تصور اُس کے دِل میں نہیں آیا ہوتا، یا اُس کے ارتکاب میں وسائل کا ہونا سنگِ راہ ہو جاتا ہے۔ یا اُس کے چھوڑنے کا باعث اللہ تعالیٰ کی خوشنودی نہیں، بلکہ کوئی اور غرض ہوتی ہے۔ اِس لئے اِس طرح گناہ کے ارتکاب سے بچا رہتا ہے، اور اُس گناہ کا نہ کرنا توبہ نہیں کہلاتا، بلکہ توبہ کے تو یہ معنی ہیں کہ وہ گناہ کو بُرائی سمجھے اور کسی فعل کی بُرائی کا اعتقاد رکھتے ہوئے

اس لئے ارتکاب کو ناپسند خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے اور اس کو چھوڑ دینے کا باعث صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا خیال ہو، کسی مخلوق کی بیم و اُمید اور کسی نفسانی غرض کا اس میں دخل نہ ہو۔ کیونکہ توبہ ایک عظیم ترین نیکی ہے اور ہر ایک نیکی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی اور اخلاص سب سے پہلی شرط ہے۔

جیسے کہ فضیل بن عیاضؒ نے آیت: لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا؟ (۶۷: ۲) کی تفسیر میں یہ فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ تم کو آزمانا چاہتا ہے اور دیکھنا چاہتا ہے کہ تم میں سے کون ٹھیک اور خالص عمل بجا لاتا ہے۔" حاضرین نے دریافت کیا، ٹھیک اور خالص عمل کے کیا معنی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ

ان العمل اذا كان خالصًا ولم يكن صوابًا لم يقبل اذا كان صوابا ولم يكن خالصا لم يقبل حتى يكون خالصا وصوابا والخالص ان يكون لله والصواب ان يكون على السنة ۔	جب کوئی عمل خالص ہو لیکن ٹھیک نہ ہو، تو وہ مقبول نہیں ہوتا، اُسی طرح اگر ٹھیک ہو لیکن خالص نہ ہو، تو بھی مقبول نہیں ہوتا۔ جو عمل خالص بھی ہو اور ٹھیک بھی ہو، وہی مقبول ہوتا ہے۔ اور خالص عمل وہ ہے، جو صرف اللہ کی رضا کے لئے کیا جائے اور ٹھیک وہ ہے جو سنّت کے طریقہ پر کیا جائے۔

اس لئے میں نے ٹھیک اور خالص کی شرط لگائی ہے۔

حضرت عمرؓ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ عَمَلِي كُلَّهُ صَالِحًا وَاجْعَلْهُ لِوَجْهِكَ خَالِصًا، وَلَا تَجْعَلْ لِاَحَدٍ فِيْهِ شَيْئًا ۔	یا اللہ! میرے تمام اعمال نیک اور اپنے لئے خالص بنا دے، اور ان اعمال میں کسی قسم کی بُرائی اور بد عملی کا دخل نہ ہونے دے۔

توبہ کی مفصّل بحث کسی دوسری جگہ درج ہے۔

مغفرت کا یقینی ذریعہ

لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اپنے آپ کو عاجز جانتا ہے اور اس لئے وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہے،

اور مغفرت طلب کرتا ہے، مگر اس گناہ کو چھوڑتا نہیں، تو ایسے شخص کے لئے مغفرت یقینی نہیں، کیونکہ اُس کی حیثیت تائب کی نہیں، بلکہ ایک ایسے سائل اور دُعا کرنے والے کی ہے جو گناہ سے بخشش تو مانگتا ہے مگر اس سے توبہ نہیں کرتا۔ اس کی بابت صحیحین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث موجود ہے:

ما من داع یدعو بدعوۃ لیس فیھا اثم ولا قطیعۃ رحم الا کان بین احدی ثلث اما ان یعجل لہ دعوتہ واما ان یدخرلہ من الجزاء مثلھا واما ان یصرف عنہ من الشر مثلھا، قالوا یا رسول اللہ! اذا نکثر قال اللہ اکثر۔

جو شخص کوئی ایسی دُعا کرے اور کسی ایسی چیز کا سوال کرے جس کا حصول گناہ اور قطع رحم نہیں تو اُس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سلوک ہوتا ہے کہ یا تو بعینہٖ اس کا سوال منظور کر لیا جاتا ہے یا آخرت میں اس کو جزا دی جاتی ہے، یا وہ اُس دُعا کی بدولت کسی شر اور مصیبت سے محفوظ رہتا ہے۔

الغرض، اسی طرح بغیر سچی توبہ کے مغفرت طلب کرنا ایک دُعا ہے جو عام دُعاؤں کی طرح بموجب حدیث مذکورۂ بالا کے خیر و برکت کا موجب ضرور ہے، لیکن ضروری نہیں کہ اس کو مغفرت دی جائے مغفرت تبھی حاصل ہو سکتی ہے، جب سچی توبہ ہو۔

پس اس سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ بعض علماء کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ گناہ پر مداومت کرنے کے باوجود مغفرت طلب کرنا جھوٹوں کی توبہ ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص اس کو توبہ سمجھتا ہے، تو بیشک وہ جھوٹا ہے۔ کیونکہ کوئی شخص تائب نہیں کہلا سکتا، جب تک وہ گناہ کو ترک نہ کر دے۔ توبہ اور گناہ پر اصرار دونوں ضدین ہیں۔

فصل

گناہوں کا استحضار اور مقبولیتِ توبہ

ترک اور ارتکاب گناہ

سائل نے اپنے سوال میں یہ بھی دریافت کیا ہے کہ کیا کسی ایک گناہ کا اعتراف کر لینا اور اس سے تائب ہو جانا اُن تمام عقوبت سے محفوظ رہنے کا موجب ہو سکتا ہے، جس کا وہ متعدد گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے مستوجب ہے، یا تمام گناہوں کا استحضار ضروری ہے؟ اس کا جواب چند اصولوں پر مبنی ہے:

پہلا اصول

یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایک گناہ سے سچی توبہ کرلے اور دوسرے کے ارتکاب میں مشغول رہے، تب بھی یہ توبہ مقبول ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ابھی صرف ایک ہی گناہ کا تقاضا توبہ کے لئے زیادہ قوی تھا، یا گناہ کا ایک ہی مانع زیادہ شدید تھا۔ اہلِ سنت کے سلف اور خلف کا یہی قول مشہور ہے۔ لیکن ابُو ہاشم معتزلی اور متکلمین کی ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ اس قسم کی توبہ صحیح نہیں۔ کیونکہ تائب نے دوسرے ذنوب ترک نہیں کئے اور اُس کی توبہ کا محرک اور باعث اگر خدائے تعالیٰ کا ڈر اور خشیت ہوتی، جس کے بغیر توبہ درست نہیں ہو سکتی، تو وہ دوسرے ذنوب میں مشغول نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ خدائے تعالیٰ کا ڈر سب گناہوں سے یکساں طور پر روکتا ہے۔ قاضی ابو یعلی اور ابن عقیلؒ نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے یہی قول نقل کیا ہے۔ لیکن امام احمدؒ کا مشہور قول پہلے قول کے مطابق ہے اور سلف میں سے کسی نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا۔

ابُو ہاشم کی دلیل کا جواب

ابُو ہاشم وغیرہ کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات کسی ایک گناہ کی شدید قباحت انسان کی دل نشین ہو جاتی ہے اور دوسرے

گناہوں کی قباحت کا تصور اُس کے دل میں اتنا شدید نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اُس ایک گناہ سے تائب ہوتا ہے اور دوسرے گناہوں کے ارتکاب سے باز نہیں رہتا۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ کوئی شخص بعض فرائض تو بجا لائے لیکن بعض دوسرے فرائض کا تارک ہو۔ اور اس میں شک نہیں کہ دوسرے فرائض کا ترک کرنا اس کے لئے پہلے فرائض کی مقبولیت سے مانع نہیں، جن کو وہ بجالاتا ہے۔ نیز ممکن ہے کہ ایک ہی فریضہ دیگر فرائض کی بجاآوری کا موجب بن جائے۔

معتزلہ اور اہلِ کبائر مگر معتزلہ نے اپنے نزدیک ایک فاسد اصول مقرر کر رکھا ہے جس کو انہوں نے خارجیوں سے اخذ کیا ہے کہ وہ کافر اور گنہگار میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں:

ان اصحاب الکبائر یخلدون فی النار ولا یخرجون منہا بشفاعۃ ولا غیرھا۔	کبائر کا مرتکب ہمیشہ دوزخ میں رہیگا اور اُس کے حق میں کوئی شفاعت وغیرہ کارگر نہیں ہو سکتی۔

اُن کے نزدیک یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ عذاب دے اور پھر اس کو جنّت میں داخل کرے اور اپنی رحمت اور عنایات کا مورد بنائے۔ کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ:

یقولون بحبوط جمیع الحسنٰت بالکبیرۃ	کبیرہ کے ارتکاب سے تمام نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔

سلف کا اعتقاد لیکن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اہلِ سنّت والجماعۃ کا مذہب اس کے خلاف ہے۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ اہلِ کبائر جنّت میں داخل ہو سکتے ہیں، اُن کے حق میں شفاعت قبول ہو سکتی ہے اور کبیرہ کا ارتکاب تمام نیکیوں کو برباد نہیں کرتا۔ تمام نیکیاں صرف کفر سے برباد ہوتی ہیں جیسے کہ تمام بُرائیاں توبہ سے زائل ہو سکتی ہیں۔ اور کبیرہ کا مرتکب اگر صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے نیکیاں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو اُن اعمالِ صالحہ کی جزا دیگا، اگرچہ وہ ارتکابِ کبیرہ کی وجہ سے عذاب کا بھی مستوجب ہے۔ قرآن کریم میں زانی، سارق اور قاتل کو بلحاظ احکامِ شرعیہ کے کافر سے الگ صنف قرار دیا گیا ہے اور آنحضرت صلعم سے جو بات متواتر طور پر منقول ہے اور جس پر صحابہ کرام رضہ نے اجماع کیا، وہ اسی قول کی تائید میں ہے، جیساکہ کسی دوسری جگہ بالتفصیل بیان ہے۔

قبولیتِ اعمال اور اتقا

انہی اقوال کی بناء پر اس آیہ شریفہ کی تفسیر میں مختلف اقوال مروی ہیں کہ :

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ (۵/۲۷) | بیشک اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے اعمال ہی قبول فرماتا ہے۔

خوارج اور معتزلہ کا یہ قول ہے کہ "کوئی نیکی بارگاہِ کبریا تعالیٰ و تقدس میں قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کرتی، جب تک اُس کا کرنے والا کامل متقی نہیں، یعنی کسی کبیرہ کا مرتکب نہ ہو"۔ مُرجئہ کہتے ہیں "متقی وہ ہے جو شرک سے اجتناب کرے"۔ اُن کے نزدیک اہلِ کبائر بھی متقی کے مفہوم سے باہر نہیں۔ لیکن اہلِ سنّت والجماعۃ کی تحقیق یہ ہے کہ ایک ایسا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے، جس کے کرنے میں تقویٰ کے مفہوم پر عمل کیا گیا ہو۔ یعنی اس کا وہ عمل اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی تعمیل کے موافق ہے، اور اس کے کرنے کی غرض محض اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ ہو۔

الغرض جو کوئی کسی عملِ صالح کے بجالانے کے دوران میں اس عمل کے متعلق متقی ہے، وہ عمل اس کا مقبول ہے، چاہے کسی دوسرے عمل کے لحاظ سے وہ غیر متقی ہو۔ لیکن اگر اُس نے کسی نیکی کے کرنے میں تقویٰ کے مفہوم پر عمل نہیں کیا تو وہ عمل اُس کا مقبول نہیں، چاہے وہ دوسرے اُمور میں اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی ایک گناہ کی توبہ بھی مقبول ہے خواہ دوسرے گناہ کا مرتکب بنا رہے۔

مقبولیت کے لئے ایمان ناگزیر ہے

البتہ ایمان کا وجود سب اعمال کی مقبولیت کے لئے ناگزیر شرط ہے۔ کلام مجید میں ہے :

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۔ (۱۷ : ۱۹)

جو شخص آخرت کا طالب ہے اور اُس کے لئے اُس کے مناسبِ حال کوشش بھی کرتا ہے تو ایسے لوگوں کی کوشش ضرور ٹھکانے لگے گی بشرطیکہ وہ مومن ہوں۔

اِسی طرح یہ آیت پہلے گزر چکی ہے کہ :

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا۔ (۴ : ۱۲۳، ۱۲۴)

جس مومن مرد یا عورت نے نیک اعمال کئے، پس ایسے لوگ جنت میں داخل کئے جائیں گے اور اُن پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کیا جائیگا۔

الغرض قرآن کریم کی آیات کے تتبع سے تم کو معلوم ہوگا کہ جا بجا اعمال صالحہ کی مقبولیت اور اُن پر جزا ملنے کے لئے ایمان کی شرط لگائی گئی ہے اور کفر کو تمام نیکیوں کا برباد کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔ کلام مجید میں ہے:

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ (۲ : ۲۱۷)

جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے اور پھر وہ کافر ہو کر مرے تو اُس کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور یہ لوگ دوزخ میں داخل ہو کر اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

بخشش بوجہ قبول اسلام

دُوسرا اُصول یہ ہے کہ جو شخص متعدد گناہوں کا مرتکب ہے تو اگر وہ بعض گناہوں سے تائب ہو جائے اور دوسرے گناہوں پر مصر رہے تو صرف اُس کا وہی گناہ بخشا جائیگا جس سے اُس نے توبہ کی ہے، اس کے دوسرے گناہوں کا وہی حکم ہے جو غیر تائب کا ہوتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں کسی نے اختلاف نہیں کیا۔

البتہ ایک شخص جو پہلے کافر تھا اور اب مسلمان ہو گیا ہے اس کی بابت اختلاف ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ کفر کی حالت میں اُس نے جتنے گناہ کئے تھے، وہ سب بخشے گئے۔ کلام پاک میں ہے:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ۔ (۸ : ۳۸)

کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ باز آجائیں تو اُن کے گزشتہ گناہ بخشے جائیں گے۔

صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے کہ:

اَلْاِسْلَامُ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ۔

اسلام قبول کرنے سے کفر کی سابقہ عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔

ترکِ ارتکاب پر جزا

لیکن بعض دوسرے علماء کا یہ قول ہے کہ اسلام کی بدولت صرف وہی گناہ بخشے جاتے ہیں، جن کا ارتکاب اُس نے ترک کر دیا ہے۔ برخلاف اس کے جن کبائر کا وہ بعد از اسلام بھی ارتکاب کر رہا ہے، اُن کی بابت اس کا وہی حکم ہے جو دوسرے مرتکبینِ کبائر کا ہے۔ اصولِ شرعیہ اور قرآن و حدیث کے نصوص یعنی تصریحات اسی قول کی تائید میں ہیں۔ اور آیت قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا جس سے استدلال کیا گیا ہے، اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ جن گناہوں کے ارتکاب سے وہ باز آ جائیں تو اس سے پہلے اُن گناہوں کا جتنا بھی انہوں نے ارتکاب کیا ہے، وہ معاف کیا جائیگا۔ محاورہ یہی ہے کہ کسی سے کہا جائے: اگر تم باز آ جاؤ تو تمہارا گزشتہ قصور معاف کر دیا جائیگا" تو اس کے بلا شک و شبہ یہی معنے ہوتے ہیں کہ اگر تم اس امر کو جس کا تم ارتکاب کرتے ہو، ترک کر دو، تو گزشتہ ارتکاب کی بابت تم پر مؤاخذہ نہیں کیا جائیگا۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ تمہارے دوسرے گناہ اور دوسری تقصیریں بھی معاف کر دی جائیں گی۔

اعمالِ جاہلیت کا مؤاخذہ

صحیحین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ حکیم بن حزام رضؓ نے آپؐ سے استفسار کیا کہ جو اعمال ہم نے جاہلیت میں کئے تھے، کیا اُن کی بابت بھی ہم پر مؤاخذہ ہوگا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا:

من احسن منکم فی الاسلام لم یؤاخذ بما عمل فی الجاهلیة و من اساء فی الاسلام اخذ فی الاوّل و الاٰخر۔	جس نے اسلام میں اپنی حالت کو اچھا بنا لیا، اُس پر اعمالِ جاہلیت کی بابت کچھ مؤاخذہ نہیں ہوگا لیکن جس نے اسلام کی حالت میں بھی بُرائیاں کیں، اُس پر اگلے پچھلے گناہوں کا مؤاخذہ ہوگا۔

اِس حدیث نے نہایت صاف الفاظ میں مؤخر الذکر قول کے حق میں فیصلہ فرما دیا ہے، الاسلام یھدم ما کان قبلہ میں چونکہ ایک گونہ اجمال ہے، اس لئے اِس حدیث کو اُس کے لئے بمنزلہ تفسیر اور بیان کے سمجھنا چاہیئے۔

فصل

توبۂ مطلق اور توبۂ عام و خاص

غفران الذنوب کلّھم

تیسرا اُصول یہ ہے کہ بعض اوقات انسان خاص خاص گناہوں کا استحضار کرتا ہے یعنی اپنے دل میں اُن کا تصور باندھتا اور اُن سے تائب ہوتا ہے، اور بعض اوقات مطلق توبہ کرتا ہے، مگر ذنوب کا استحضار کچھ بھی نہیں کرتا بلکہ اُس کی نیّت عام گناہوں سے توبہ کرنے کی ہوتی ہے۔ کیونکہ عام گناہوں سے تائب ہونے اور "عام توبہ" کے یہ معنی ہیں کہ اُس نے اس بات کا پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ وہ ہر ایک مامور کو عمل میں لائے اور ہر ایک ممنوع اور منہی عنہ کو چھوڑ دے، اور اس کے ضمن میں تمام گناہوں کے متعلق ایک عام ندامت[1] پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ مسند میں ابن مسعودؓ کی ایک روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا: النَّدمُ توبۃ" (ندامت بھی ایک قسم کی توبہ ہے)۔ جب ظاہر ہو جائے کہ تائب ایک عام توبہ کرتا ہے، تو ایسی توبہ سے تمام گناہ بخشے جاتے ہیں اگرچہ ہر ایک گناہ کا جداگانہ تصور ذہن میں نہ ہو، لیکن اگر اس عام توبہ کے خلاف واقع ہو گی تو توبہ خاص کہلائیگی۔

کونسا گناہ عام توبہ سے نہیں بخشا جاتا

البتہ اگر کوئی ایسا گناہ ہے کہ اگر وہ اُس کے ذہن میں مستحضر بھی ہو جاتا تو وہ اُس سے تائب نہ ہوتا۔ کیونکہ اُس گناہ کو چھوڑنے کی بابت ابھی اس کے دل میں عزیمتِ راسخہ پیدا نہیں ہوئی جو اُس کو آمادۂ عمل کرے، یا وہ ایک ایسا گناہ ہے جس کو بزعم خود قبیح سمجھتا ہی نہیں، تو اس قسم کا گناہ عام توبہ کے ضمن میں داخل نہیں۔ اور جب تک خصوصیت کے ساتھ اس گناہ سے توبہ نہ کرے اُس کے بخشے جانے کی

---

[1] ندامت کے مختلف اقسام بیان کر کے اعتقادات، ارادت اور آلام کے ایذا، لذّات وحظوظ مانند غم و حزن اور فرح و سرور جو نفسِ انسانی کو لاحق ہوتے ہیں، اس کا احساس کرایا ہے جو ترک کر دیا ہے۔

یقینی توقع نہیں کی جاسکتی، کیونکہ یقینی مغفرت کا ذریعہ صرف توبۂ مقبولہ ہے اور بس۔

عام توبہ اور مجمل توبہ

لیکن اگر کوئی شخص ہر ایک گناہ سے توبہ کرنے کا التزام نہیں کرتا، مگر کسی گناہ کی تخصیص بھی نہیں کرتا، تو اس قسم کی توبہ "توبہ مجمل" کہلاتی ہے اور اس کے مفہوم میں سب گناہ داخل نہیں سمجھے جاتے، اور اس لئے وہ عام مغفرت کا موجب بھی نہیں قرار دی جاسکتی۔ توبہ عام اور توبہ مجمل کا فرق ملحوظ رکھنا لازم ہے، کیوں کہ ہر ایک کا حکم جُداگانہ ہے۔

صفتِ حقائق ایمانیہ

اکثر لوگ توبہ کرتے وقت (خواہ ان کا توبہ عام بھی ہو) فقط بعض فُحش گناہوں کا استحضار کرتے ہیں یا ہاتھ اور زبان سے صادر شدہ گناہ اُن کے پیشِ نظر ہوتے ہیں، حالانکہ وہ ظاہر یا باطن میں ایسے مامور شرعی کا تارک ہوتا ہے جس کا بجالانا اُس پر فرض ہے، اور وہ حقائقِ ایمانیہ کا ایک ایسا اہم شعبہ ہوتا ہے جس کا ترک کرنا اُن فواحش کے ارتکاب سے بہت زیادہ مضر ہوتا ہے، جن کا تصوّر اُن کے ذہن میں ہے۔ اِس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جن حقائقِ ایمانیہ کے ساتھ موصوف ہونے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جن کی بدولت انسان سچّے مومنوں کے زُمرہ میں داخل ہوتا ہے، وہ بعض ظاہری گناہوں کے ترک کردینے سے بہت زیادہ نافع ہیں۔

اللہ اور رسولؐ کی محبت

مثلاً اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُول کی محبت سے دل کو معمور رکھنا، اعمالِ حسنہ کی عظیم ترین نیکی ہے۔ صحیح بخاری میں مروی ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک صحابی تھا جو حمّار کے لقب سے مشہور تھا۔ وہ اکثر شراب پیا کرتا تھا۔ چنانچہ کئی مرتبہ اُس کو شراب پیتے پکڑا بھی گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شراب نوشی کی سزا دی۔ ایک شخص نے اس کی یہ حالت دیکھ کر کہا کہ "اِس پر خُدا کی لعنت ہو، کتنی دفعہ سزایاب ہُوا پھر بھی اپنی کرتوت سے باز نہیں آتا۔" آنحضرت صلعم نے یہ سُن کر فرمایا:

لا تلعنه فانه یحب الله ورسوله	اس پر لعنت نہ کرو، وہ اللہ اور اُس کے رسُول سے محبت کرتا ہے

تم جانتے ہو کہ شراب کے پینے والے اور نچوڑنے والے پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے لیکن ایک ایسے شخص پر جو بیگاہے نوش ہے، صرف اس لئے لعنت بھیجنے سے منع فرمایا کہ اُس کے دِل میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسُول کی محبّت موجود ہے۔

اسی طرح جو آیتیں اور حدیثیں مطلق تکفیر اور مطلق وعید کے مضمون پر مشتمل ہیں، وہ بعض شرائط کے ہونے اور بعض موانع کے نہ ہونے کے ساتھ مشروط ہیں۔ مثلاً جو شخص کسی گناہ سے تائب ہو جائے، اس کے لئے وعید نہیں۔ تمام مسلمانوں کا اس پر اتّفاق ہے۔ یا مثلاً جس شخص کی نیکیاں اس قدر زیادہ ہوں کہ اُس کے گناہ کو مٹا دینے کے لئے کافی ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

عقوبت ٹل جانے کے اسباب جن گناہوں کے ارتکاب پر دوزخ کی سزا مقرر ہے، اُس عقوبت کے ٹل جانے کے متعدد اسباب ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:-

سچی توبہ۔ کثرتِ اعمالِ صالحہ۔ اِس دُنیا کے مصائب اور شدائد میں مُبتلا ہونا۔ برزخ اور میدانِ قیامت کی سختیاں۔ نیز مومنوں کی دُعا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت۔ یہ سب ایسے اسباب ہیں جو اعمالِ سیّئہ کی کفارت کا باعث اور خدا کی مغفرت کا موجب ہوتے ہیں۔

بہرکیف اگر توبہ کسی خاص گناہ سے کی گئی ہے یا "توبہ مجمل" ہے تو اس سے عام مغفرت کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ برخلاف اس کے "توبہ عامہ" سے سب گناہ بخشے جاتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ توبہ عامہ نہیں کرتے، حالانکہ ہر ایک شخص کو اس کی ضرورت ہے، کیونکہ ہر ایک شخص کم و بیش مأمورات شرعیہ کے بجالانے میں کوتاہی کرتا ہے اور بعض منہیات کا ظاہر یا باطن میں مرتکب ہوتا ہے۔ اس لئے ہر ایک شخص پر ہر ایک حالت میں توبہ کرنا لازم ہے۔ کلامِ پاک میں ہے:

وَتُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (۳۱ : ۲۴)	اے مومنو! تم سب کے سب اللہ تعالےٰ کی طرف توبہ کرتے ہوئے پھر آؤ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم فلاح پاؤ گے۔

فصل ۹

تعلّق باللہ جوڑنے کا سر رشتہ

مفہوم توحید ربوبیت

سائل کا آخری استفسار یہ ہے کہ اس میں کیا راز ہے کہ مصیبت تب دُور ہوتی ہے جبکہ آدمی تمام لوگوں سے اپنی اُمید کا رشتہ منقطع کرلے؟ اور مخلوقات سے اپنی امید قطع کرکے اللہ تعالیٰ کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی تدبیر کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی تدبیر توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت دونوں قسم کی توحید پر ثابت قدم رہنا ہے۔ توحیدِ ربوبیت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک اللہ تعالیٰ کو تمام اشیاء کا خالق اعتقاد کرے اور یہ کہ اُس کے بغیر کوئی بھی قدرت نہیں رکھتا کہ کوئی بات بالاستقلال اس سے ظہور میں آئے، بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے، اور جو نہیں چاہتا، وہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے سوائے اللہ تعالیٰ کے جو کوئی بھی ہو، اگر بالفرض کسی بات کے ظہور میں آنے کا اس کو سبب مانا جائے، تب بھی وہ اُس کے انجام دینے میں کسی معاون کا بالضرور محتاج ہوگا، اور لامحالہ اُس کا کوئی ایسا ضد اور شریک بھی ہوگا جو اس کو اپنے ارادے کی تنفیذ سے روک سکے۔ اس لئے اپنی مرادیں اور اپنی حاجتیں صرف اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہیئے۔

افعالِ اختیاریہ میں عجز انسانی

سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسروں کی بے بسی کی تو یہ کیفیت ہے کہ جو افعالِ اختیاریہ کہلاتے ہیں، اُن کے کرنے میں بھی انسان مستقل نہیں بلکہ سراسر اللہ تعالیٰ کی اعانت کا محتاج ہے۔ جب تک وہ اُس کے دل میں عزم راسخ پیدا نہ کرے، جو انسان کو آمادۂ عمل کرتی ہے اور ازاں بعد اُس کے اعضاء اور جوارح میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ قدرت موجود نہ ہو، جو حدوثِ فعل کے لئے شرط ہے، اُس وقت تک کسی فعل کا ظہور میں آنا ناممکن ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ:

مَاشَآءَاللّٰهُ كَانَ وَمَالَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ۔	اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے سو ہوتا ہے، اور جو چاہتا ہے کہ نہ ہو، وہ کبھی نہیں ہو سکتا

اپنے وسیع ترین معنوں میں بالکل درست ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ، وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۸۱: ۲۸، ۲۹)	یہ تم میں سے اس شخص کے لئے ہے جو راست روی چاہتا ہے، تم نہیں چاہو گے مگر جب اللہ چاہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا، وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا، يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ، وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۔ (۷۶: ۲۹، ۳۱)	جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرے۔ تم کچھ نہیں چاہو گے مگر جب اللہ چاہے۔ بے شک اللہ جاننے والا حکمت والا ہے، جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل فرماتا ہے اور ظالموں کے لئے درد دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

سب سے بڑی ذلت

جو شخص اپنے جیسی مخلوق سے کسی مُراد کا طالب ہے، وہ ایک عاجز کے سامنے دستِ نیاز پھیلا کر اپنے آپ کو مفت میں ذلیل کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ۔ (۷: ۱۹۴)	بیشک جن کو تم اپنا حاجت روا سمجھ کر پکارتے ہو، وہ تمہاری ہی طرح خدا کے محتاج بندے ہیں۔

یہ ایک ایسا شرک ہے جس کو اللہ تعالےٰ کبھی معاف نہیں فرماتا۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (۴: ۴۸/۱۱۶)	بیشک جس کسی نے شرک کیا، اللہ تعالیٰ اُسے ہرگز نہیں بخشیگا ہاں، اس کے سوا جسے چاہے، بخش دے۔

عرفانِ اُلوہیت

دُوسری تدبیر توحیدِ اُلوہیت کی حقیقت پر کاربند ہونا ہے، جس کا مفہوم پہلے بھی بیان ہو چکا ہے، یعنی صرف اللہ تعالیٰ سے کامل محبت رکھنا، اُسی کا حکم ماننا،

اُسی کی ذاتِ پاک پر بھروسہ کرنا، اپنی بیم و اُمید کا مرکز اُسی کو قرار دینا، اُسی سے اپنی حاجتوں کے لئے سوال کرنا اور اُسی کے آگے سرِ نیاز جھکانا، وغیرہ وغیرہ۔

اب اگر کوئی شخص دونوں قسم کی توحید پر ثابت قدم رہے تو زہے سعادت! یہ شخص دُنیا اور آخرت میں نہایت ہی خوش قسمت انسان ہے لیکن اگر وہ اس قسم کا آدمی ہے جس کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ:

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا، فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ۔ (۱۰ : ۱۲)

جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ لیٹے ہوئے اور بیٹھے اور کھڑے ہمیں پکارتا ہے، لیکن جب ہم اُس کی تکلیف کو دُور کر دیتے ہیں، تو وہ اس طرح گذرا چلا جاتا ہے گویا اُس نے کبھی کسی تکلیف کے دُور کرنے کے لئے ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔

یا وہ اُن اشخاص میں سے ہو، جن کا بیان اس آیت میں ہے:

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِى الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ، فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ، وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا۔ (۱۷ : ۶۷)

جب تمہیں سمندر میں تکلیف پیش آتی ہے تو جن کو تم پکارا کرتے ہو، وہ سب بھول جاتے ہیں اور صرف خدا کی طرف رجوع کرتے ہو، لیکن جب وہ تم کو نجات دے کر خشکی پر لاتا ہے، تو تم رُوگردان ہو جاتے ہو۔

ایسے آدمیوں کے لئے اُن کا اعترافِ توحید ایک حجت ہے جو قیامت کے دن اُن کے برخلاف فیصلہ دلانے کا موجب ثابت ہو گی۔ چنانچہ قرآن کریم میں اُن مشرکین کو جو صرف توحید ربوبیت کے قائل تھے، اور توحید اُلوہیت کے مقتضا پر عمل پیرا نہیں تھے، ان کے اپنے اقرار اور تسلیم کی وجہ سے اُنہیں جھوٹا ٹھہرایا جائیگا۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ، قُلْ

(اے نبیؐ! ان منکروں سے) پوچھئے: اگر تم جانتے ہو تو بتلاؤ کہ زمین اور تمام مخلوقات جو اس میں ہے، کس کے

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ، قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ، قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ، قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ، قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ۔ (۲۳ : ۸۴ تا ۸۹)

لئے ہے؟ وہ فوراً کہیں گے اللہ کے لئے۔ پھر آپ فرمائیں، کیا تم غور نہیں کرتے! آپ ان سے پوچھیں: وہ کون ہے جو ساتوں آسمانوں کا پروردگار ہے اور جہانداری کے عرش عظیم کا مالک ہے؟ وہ کہیں گے: یہ سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے۔ پھر آپ فرمائیں: تمہیں کیا ہو گیا کہ شرک کے نتیجہ سے نہیں ڈرتے! آپ ان سے پھر پوچھیں: وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمام چیزوں کی بادشاہی ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے اور کوئی نہیں جو اُس کے اوپر پناہ دینے والا ہو۔ وہ کہیں گے: یقیناً یہ تو اللہ ہی کے لئے ہیں۔ آپ فرمائیں: پھر تم پر کونسا جادو کیا گیا ہے کہ راہِ حق سے منحرف ہوئے جاتے ہو؟

اور فرمایا:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ، فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔

(۲۹ : ۶۱)

اگر تم اُن سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کس نے مطیع بنایا؟ تو وہ ضرور اس کے جواب میں کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا۔ کہہ دو کہ پھر تم کیوں پھرے جاتے ہو؟[1]

الغرض، قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ مضمون دوہرایا گیا ہے۔

نزولِ مصائب، نعمتِ عظمیٰ

حقیقت میں یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ وہ اپنے مومن بندوں پر مصائب اور شدائد نازل فرماتا ہے، جن کی بدولت وہ اُس کی توحید پر مائل ہونے اور خاص اللہ تعالیٰ کو پکارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اِس حالت میں اُن کی بیم و اُمید کا مرجع اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہوتی ہے۔ اُن کے دلوں میں توکل اور انابت پیدا

---

[1] یعنی توحیدِ ربوبیت کا اعتراف کرنے کے باوجود کیوں توحیدِ اُلوہیت پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ حالانکہ یہ دونوں لازم ملزوم ہیں۔

ہوتی ہے، اور شرک سے بیزار ہو کر اُن کے قلوب نورِ ایمان کے ساتھ معمور ہوتے ہیں۔ اور یہ ایک نعمتِ عظمیٰ ہے جو مرض اور خوف کے زوال اور فراخیٔ رزق کے حصول سے بدرجہا بڑھ کر ہے[1] کیونکہ مرض اور مصیبت کا زوال اور فراخیٔ رزق وغیرہ جسمانی راحتیں اور دُنیاوی خوشیاں ہیں جو کافروں کو چند روزہ حاصل ہوتی ہیں، لیکن ان سے بدرجہا بہتر وہ توحیدِ خالص ہے، جو ایک ابدی سعادت ہے۔ جو لذّت اور حلاوت مخلص موحّدین کو اس سے حاصل ہوتی ہے، اُس کا لفظوں میں اظہار کرنا دشوار ہے۔ ہر ایک مومن موحّد کو بقدر اس کے ایمان اور درجۂ توحید کے اس سے حصّہ ملتا ہے۔ اسی بنا پر سلف صالحین میں سے کسی نے کہا ہے کہ:

یا ابن آدم! لقد بورك لك حاجة اكثرت فيها من قرع باب سيدك۔

اے بنی آدم! تمہیں تمہارا احتیاج ہونا مبارک ہو، اس تقریب سے تم کو اپنے مولائے کریم کا دروازہ کھٹکھٹانے کی سعادت حاصل ہو گی۔

ہجومِ مشکلات اور حلاوتِ مناجات

ایک شیخِ طریقت کا قول ہے کہ بعض اوقات مجھے کوئی مشکل پیش آتی ہے، جس کے رفع ہونے کے لئے بارگاہِ الٰہی تعالےٰ شانہٗ میں ملتجی ہوتا ہوں۔ اس اثناء میں مجھ کو وہ حلاوتِ مناجات میں حاصل ہوتی ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میری حاجت جلد پوری ہو۔ ڈر یہ ہوتا ہے کہ پھر میرا نفس اُس خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔ کیونکہ نفس ہمیشہ اپنے حظوظ کا خواہشمند ہوتا ہے اور اگر اُس کی حاجت پوری ہو جائے، تو پھر وہ کسی کی پروا نہیں کرتا۔

خاتمۃ الکتاب

بعض کتبِ سابقہ میں آیا ہے کہ:

یا ابن آدم! البلاء یجمع بینی وبینك والعافیة تجمع بینك

اے آدم کے بیٹے! مصیبت میں تمہارا تعلق میرے ساتھ ہو جاتا ہے اور عافیت میں تمہارا تعلق اپنے نفس کے

[1] کاش، انسان کو اس حالت پر ثابت قدم رہنا نصیب ہوتا۔ لیکن یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ اِدھر سختی اور تکلیف دُور ہوئی، اُدھر توحید کافور ہوئی۔ فاللہ ھو المستعان وعلیہ التکلان۔

وبین نفسک ۔ | ساتھ ہوتا ہے ۔

یہ ایک حقیقت ہے اور ہر ایک سچا مومن اپنے باطن میں اس حلاوتِ ایمان کا ادراک کر سکتا ہے۔ لیکن یہ اور بات ہے کہ کسی میں ایمانی ذوق اور وجدان کی کمی ہو۔ کیونکہ وہ حالت جو صاحبِ ایمان کو اُس وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ وہ اپنے قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ پاتا ہے، اس کا دِل خالص اللہ تعالیٰ کی محبت سے معمور ہوتا ہے، اُس کا بھروسہ صرف اللہ تعالےٰ کی ذاتِ پاک پر ہوتا ہے، اُس کا حُب اور بُغض کسی اَور کے لئے نہیں، بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتا ہے اور اُس کی اُمید و بیم کا مرجع اُسی کی ذاتِ پاک ہوتی ہے۔ وہ خاص اُسی کی عبادت کرتا ہے اور فقط اُس سے توفیق اور اعانت کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے کچھ بھی ارادہ نہیں کرتا، بلکہ اُس نے اپنا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کی مرضی میں فنا کر دیا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس کا صرف ذوق اور وجدان ہی سے ادراک ہو سکتا ہے۔ (سے

ذوقِ ایں مے نشناسی بخُدا تانہ چشی)

ہر ایک مومن کو اس کا کم و بیش حصہ عنایت ہوا ہے اور یہ دینِ اسلام کی وہ حقیقت ہے، جس کی اشاعت کے لئے اللہ تعالےٰ نے تمام رسولوں کو بھیجا اور اُن پر کتابیں نازل فرمائیں اور قرآن کریم کی تعلیم کا مرکز و محور یہی ہے۔ وفقنا اللہ تعالیٰ لذلک، واللہ تعالیٰ اعلم و علمہ اتم واحکم۔

تمام شد

ضمیمہ از ناشر

اسم اعظم شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے رسالہ الکلم الطیب من اذکار النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت سعد بن ابو وقاص رض سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

دعوۃ ذی النون اذ دعا بہا وھو فی بطن الحوت: لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ، لم یدع بہا رجل مسلم فی شیٔ قط الا استجاب اللہ لہ۔

حضرت یونس علیہ السلام کی وہ دُعا جس کے ذریعہ اُنہوں نے مچھلی کے پیٹ میں دُعا کی تھی "لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ہے۔ اِن الفاظ کے ذریعہ جس مسلمان آدمی نے بھی جب کبھی اپنی کسی حاجت کے لئے دُعا کی تو وہ ضرور ہی پُوری ہو کر رہی۔

امام ترمذیؒ نے ایک دوسری روایت کے یہ الفاظ بیان کئے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انی اُعلّمک کلمات لا یقولہا مکروب الا فرج اللہ عنہ کلمۃ اخی یونس علیہ السلام۔

کیا میں تجھے اپنے بھائی حضرت یونس علیہ السلام کی دُعا کے وہ الفاظ نہ سکھا دوں کہ کوئی مصیبت زدہ ایسا نہیں ہے جس نے اِن الفاظ میں دُعا کی ہو اور اللہ تعالیٰ نے اُسے پُورا نہ کیا ہو!

اس بنا پر دعائے حضرت یونس علیہ السلام کو اسم اعظم قرار دیا جائے تو بعید از قیاس نہیں۔ بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام بھی جب کسی حاجت مند کو وظیفہ بتلاتے ہیں تو آیتِ کریمہ کا ورد ہی سکھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اس دُعا کی برکت سے سب کی حاجتیں پُوری ہو جاتی ہیں۔

حضرت مولانا عبدالغفور صاحب بن مولوی محمد بن مولانا عبداللہ الغزنوی نے بھی اسم اعظم کے متعلق تمام حدیثوں کو جمع کر کے ایک دُعاء تجویز فرمائی ہے۔ یقین کیا جاتا ہے

کہ اسمِ اعظم اس میں ضرور رہوگا۔ اس لئے شائقین حضرات اور قارئین کرام کی خاطر اس دعاء کو یہاں درج کیا جاتا ہے، تاکہ اس سے مستفیض ہو سکیں۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ بے حد حزم و احتیاط سے کام لیا جائے۔ صرف جائز و مشروع کاموں کے لئے ہی اس کے ذریعہ طلب و دعاء کا ہاتھ پھیلایا جائے۔ ناجائز اور غیر مشروع کاموں کے لئے ہرگز استعمال نہ کیا جائے۔ ورنہ نفع کی بجائے نقصان کا زیادہ احتمال ہے۔ دعاء مانگنے کے بعد سو مرتبہ درود شریف پڑھے۔ امید ہے کہ ضرور دعا مقبول ہوگی انشاء اللہ العزیز۔ دعاء یہ ہے:۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

خدائے رحمٰن و رحیم کے مبارک و مقدس نام کے ذریعہ طالبِ دعا ہوں

الٓمّٓ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ۔

اسی خدائے جل و علیٰ نے اپنی مقدس کتاب مقدس فرشتے کے ذریعہ اپنے مقدس رسول پر نازل فرمائی ہے۔ اس خدا کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں، وہ خود زندہ ہے، سب اسی کی طفیل زندہ ہیں، وہ خود قائم ہے، سب اسکی قدرت سے قائم ہیں۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ،

وہ خدا وہ ہے جس کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں۔ وہ تمام ظاہر اور پوشیدہ بھیدوں کا جاننے والا ہے۔ دنیا میں بھی اسی کی رحمت کارفرما ہے اور آخرت میں بھی اسی کا فیضانِ رحمت جلوہ گر ہوگا۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔

وہ خدا وہ ذاتِ پاک ہے جس کے سوا کوئی بھی لائق پرستش نہیں، وہی جل و علیٰ قدوسیت کا بادشاہ، سلام و سلامتی کا مالک، امن و راحت کا ذمہ دار، حفاظت و نگہبانی کا ضامن، غالب و زبردست، صاحبِ جبروت و کبریائی ہے، جو مشرکین کے تمام قسم کے شرکوں سے پاک و بےعیب ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ

وہی خدائے باری تعالیٰ، جو پیدا کرنے والا، ہماری شکل و صورت بنانے والا ہے، اسی کے لئے اسمائے حسنیٰ ہیں، جو کچھ زمین و آسمان میں موجوداتِ عالم ہے، سب اسی کی تسبیحات کے گیت گاتے ہیں

وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

وہ بڑا زبردست حکمت والا ہے۔

وَاِلٰـهُـكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۔

پھر خدا خود فرماتا ہے کہ تمہارا معبود وہی خدائے واحد و یگانہ ہے جس کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں، وہ رحمٰن و رحیم ہے کہ اس کی رحمت کا ہر جگہ اس دنیا میں بھی دور دورہ ہے اور آخرت میں بھی اس کی رحمت کارفرما ہوگی۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۤءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۤءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۤءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۤءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاۤءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

رسولِ خدا کو حکم ہے کہ اس طرح دست بدعا ہوں: اے خدا، جو زمین آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے، تو جسے چاہتا ہے سرفراز کرکے سلطنت فرما دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے بادشاہی چھین کر فقیر بے نوا بنا دیتا ہے، تو ہی جسے چاہے عزت بخش دے اور جسے چاہے ذلیل و خوار کردے، تیرے ہی قبضۂ قدرت میں سب بھلائیوں کی باگ ڈور ہے، تیری قدرت سب چیزوں کو محیط ہے، رات کو تو ہی دن میں داخل کرتا اور دن کو بھی تو ہی رات میں داخل کر دیتا ہے، نیز مردہ چیز سے زندہ چیز پیدا کر دینا اور زندہ سے مردہ کو نکال دینا تیری ہی قدرت کا کرشمہ ہے، اسی طرح جسے تو چاہتا ہے دنیاوی مال و دولت اور کھانے پینے کی چیزیں اس فراوانی سے عطا فرما دیتا ہے جس کی کوئی حد ہے نہ حساب۔

لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔

تیرے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں۔ تو ہر عیب و نقص سے پاک و بے عیب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں خود ہی بے انصاف و ظالم ہوں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ بِاَنَّ لَكَ الْحَمْدُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَا

خدایا! میں تیرے حضور اس لئے سائل بن کر آیا ہوں کہ تو ہی سب خوبیوں اور کمالوں کا مالک ہے۔ تیرے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں۔ تو بہت بڑا مہربان، بہت بڑا محسن، آسمانوں اور زمینوں کا بنانے والا ہے، اے بزرگی والے، بخشش کرنے والے

ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ!

خدایا! اے جو خود زندہ ہے، باقی سب کو زندہ رکھتا ہے، خود قائم ہے، باقی سب کو تھامے ہوئے ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ بِاَنِّيْ اَشْهَدُ اَنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔

اے خدا! میں تیرے حضور میں اس بات کی شہادت دیتا ہوا سائل بن کر آیا ہوں کہ تو وہ اللہ ہے کہ تیرے سوا کوئی دوسرا لائق عبادت نہیں اور تیری ذات واحد و یکتا اور بے نیاز ہے اور تیری ذاتِ پاک وہ ذات ہے کہ نہ کسی نے تجھے جنا ہے اور نہ کوئی تیرا جنا ہوا ہے اور نہ ہی تیرا کوئی ہمسر اور کنبہ اور برادری ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ بِاسْمِكَ الطَّاهِرِ الطَّيِّبِ الْمُبَارَكِ الْاَحَبِّ اِلَيْكَ الَّذِيْ اِذَا دُعِيْتَ بِهٖ اَجَبْتَ وَاِذَا سُئِلْتَ بِهٖ اَعْطَيْتَ وَاِذِ اسْتُرْحِمْتَ بِهٖ رَحِمْتَ وَاِذِ اسْتُفْرِجْتَ بِهٖ فَرَجْتَ۔

خدایا! میں تیرے اس مبارک نام کے ذریعہ تجھ سے سوال کرتا ہوں جو طاہر، طیّب ہے، اور تجھے بے حد محبوب ہے۔ جبکہ دعا کیا جائے تو اس کے ساتھ تو قبول فرماتا ہے اور جب اس کے ذریعے تجھ سے سوال کیا جائے تو دے دیتا ہے تو، اور جب اس کے واسطے سے تجھ سے رحم طلب کیا جائے تو رحم فرماتا ہے تو، اور جب اس کے وسیلے سے کشادگی چاہی جائے تو فراخی کر دیتا ہے تو۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَدْعُوْكَ اللّٰهَ وَاَدْعُوْكَ الرَّحْمٰنَ وَاَدْعُوْكَ الرَّحِيْمَ وَاَدْعُوْكَ بِاَسْمَائِكَ الْحُسْنٰى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ اَعْلَمْ يَا رَبِّ يَا رَبِّ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوْحِ۔

خدایا! میں تجھے اللہ کہہ کر پکارتا ہوں، رحمان کہہ کر پکارتا ہوں، رحیم کہہ کر پکارتا ہوں، اور میں تیرے ان تمام اسمائے حسنیٰ کے ذریعہ بھی پکارتا ہوں، جن کو میں جانتا ہوں اور جن کو میں نہیں جانتا۔ پروردگارا! میرا مربی اللہ ہی ہے، اس کے بغیر کوئی رب نہیں، وہی عرشِ عظیم کا رب ہے، بہت بڑی بے عیب اور پاکیزہ ذات ہے، ہمارا بھی رب ہے، فرشتوں اور روح الامین کا بھی رب ہے۔

تمت

مفصل فہرست مفت طلب کریں

الہلال بک ایجنسی کے پیش نظر ان اعلیٰ نامور اور بلند پایہ عربی تصانیف کے اردو تراجم ہیں جن کا مطالعہ اصلاح عقائد، اسلام اور اخذ و فہم حقیقت اسلامیہ کے لئے نہایت ضروری و ناگزیر ہے۔ اس سلسلہ میں جس امام السنۃ جس مومن کامل جس مجاہد حق اور جس یکتائے مقامات علم و فضل شخصیت کی اہم تصانیف کے تراجم کی تکمیل ایجنسی ہذا کی مساعی کا مرکز و محور ہے وہ شیخ المجاہدین، ملاذ المجددین، سند الکاملین، امام العارفین، وارث الانبیاء، قدوۃ الاولیاء حضرت شیخ الاسلام تقی الدین ابی العباس احمد بن تیمیہ رضی اللہ عنہ وارضاہ کا وجود مبارک ہے۔ اسی ضمن میں شیخ الاسلام کے تلمیذ رشید حافظ ابن قیم اور امت کے جلیل و عظیم صف کے بعض دوسرے بزرگوں کی تصانیف کے تراجم شائع کرنا اور انہیں عام و رائج کر دینا بھی ہمارے مقاصد میں داخل ہے۔

امام ابن تیمیہ علم کا بحر زخار ہیں جس کے کناروں کا کوئی پتہ نہیں لگتا۔ وہ مجتہد مطلق، بلکہ خود مختار شہنشاہ ہیں اور علم کی وسیع مملکت میں جس طرح چاہتے ہیں حکمرانی کرتے ہیں ——— متقدمین میں کم اور متاخرین میں ایک بھی ان جیسا صاحب علم پیدا نہیں ہوا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی ہیں، سید الانبیاء علیہ السلام کے معجزوں میں سے ایک بڑا معجزہ ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر چند روشن مینار ہیں، تاریک سمندر میں جہاز کے لئے ہدایت کا ستارہ ہیں، امت محمدیہ کا فخر ہیں، گمراہوں کے لئے تازیانہ ہیں، مبتدعین پر شمشیر برہنہ ہیں، اہل جمود پر برق و صاعقہ ہیں۔ ظالم بادشاہ جس طرح قید خانہ کی اندھیری کوٹھڑی میں انہیں بند کر کے اس آفتاب کی روشنی پھیلنے سے روک نہ سکے اسی طرح موت کا بے پناہ ہاتھ بھی قبر کے اندر چھپا کر ان کی ضوفشانی بند نہ کر سکا۔

ابن تیمیہؒ زندہ ہیں کیونکہ ان کی زر و جواہر سے لبریز کتابیں زندہ ہیں اور طالبان کیلئے آب حیات کا سرچشمہ جاری کئے ہیں۔ مبارک ہیں وہ نفوس قدسیہ جو اس دور جہل و ظلمت اور شرک و بدعت میں اس کے نور سے روشنی حاصل کریں۔ اور مبارک ہیں وہ وارثین انبیاء جن کے دل ان کے علوم و معارف کے فہم و نشر کے لئے کھل جائیں۔

امام ممدوح کی بلندی منصب اور رفعت منزلت کی حقیقت معلوم کرنے اور اس بارے میں جن حضرات کو تفصیلی بحث دیکھنے کا شوق ہو وہ حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کے تذکرہ میں شرح مقام عزیمت و دعوت اور مولانا غلام رسول مہر رئیس التحریر روزنامہ انقلاب لاہور کی سیرت امام ابن تیمیہ ملاحظہ فرمائیں۔ کیونکہ ان کے مضامین کا بیشتر حصہ امام موصوف کے فضائل و مناقب اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

اس سلسلہ کی خصوصیت امتیازی یہ ہے کہ جو کچھ بھی سپرد قلم ہوا ہے از سرتاپا کتاب و سنت سے ماخوذ ہے آئمہ اربعہ کے اقوال و آراء کے عین مطابق ہے۔

آج تاریکی کا پردہ چاک ہو چکا ہے اور ابن تیمیہؒ آفتاب بن کر چمک رہے ہیں۔ لوگ ان کی تصنیفات نہایت شوق سے پڑھتے ہیں اور ان کی اہم کتابوں کے ترجمے ہو رہے ہیں اور تشنگان علوم کتاب و سنت ان سے سرسبز و شاداب ہو رہے ہیں۔ آپ حضرات بھی ان کتابوں کو زیر مطالعہ رکھیں اور دین اسلام کی روشنی حاصل کر کے دین و دنیا کی سرخروئی سے بہرہ اندوز ہوں۔ فقط والسلام مع الاکرام

ناظم: الہلال بک ایجنسی ۔ فاروق گنج ۔ لاہور

صرف ڈائنل لاہور آرٹ پریس لاہور میں چھپا